رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامہ فضیلۃ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر
جناب پنڈت رام رتن صاحب مضطر

جلد ۱۹ — نمبر ۴
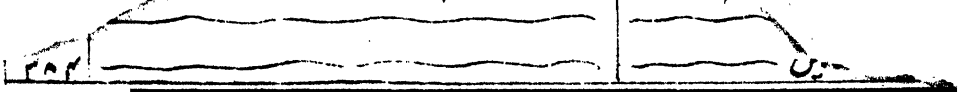
فہرستِ مضامین

بابت ماہِ اپریل ۱۹۳۱ء

تصاویر:- ۱۔ خضرِ راہ ۲۔ جدید مصری صنعت کا ایک نمونہ

فلک پیمائیاں

عاشق کی دعا :-

اے خُدا! میرا دل چکنا چُور کر دے کیونکہ میرے سارے دل سے میرے دل کے چند ٹکڑے بہتر ہیں کسی ٹکڑے میں تُو ہے کسی ٹکڑے میں وہ ہے -

اے خُدا! اِن گنتی کے چند ٹکڑوں میں تُو خود بھی رہتا ہے اور اوروں بھی بھیجتا ہے - اے خُدا! تُو خود بھی برحق ہے، تیرے رسول بھی برحق ہیں - اے خُدا! تیرا حکم تو یہ ہے کہ تیرے رسولوں میں فرق نہ کروں مگر میں تیرے اِس حکم کی تعمیل فرط مبالغے سے کرتا ہوں یعنی. اس طرح کہ خود تجھ میں اور تیرے بھیجے ہوؤں میں بھی فرق نہیں کرتا - میرے دل کے اندر تُو نہ ہو وہ ہو ایک ہی بات ہے -

---

(محبت کی کھلی ہوا میں جن کا دم گھٹتا ہے وہ یہ سطریں نہ پڑھیں)

اے خدا! میری بغاوت کو ہی میری عبادت سمجھ لے - تیرے لئے میرے پاس سوائے گستاخی کے اور کوئی تحفہ نہیں -

اے خُدا! عبادت کی شوخی مجھ سے نہیں ہوتی -

اقوال :-

اخلاقی ترقی کا لُب لباب یہ ہے کہ انسان پُرانی بُری عادتوں کو نئی بُری عادتوں سے بدلتا رہے مگر بنی نوع انسان نے اپنی پانچ دس ہزار سال کی تاریخی زندگی میں بُری عادتوں کو اس فضول خرچی سے استعمال کیا ہے کہ شیدائیانِ سوائی کو تلاش سے بھی نئی بُری عادت دستیاب نہیں ہوتی اور اب یہ حالت ہے کہ عیوب کے لئے بھی زمانہ ماضی کی خوشہ چینی سے مفر نہیں اللہ کی دنیا میں اللہ کے بندے سب کچھ آزما چکے -

---

اِس زمانے میں تو روشنی بل کھا کر چلتی ہے - انسان کیا سیدھا چلے گا؟ خود نور میں خم ہے - جو سیدھا چلا اور بہت سی چلا سو مرا - قانونِ حیات سُست روی ہے - جو کام کرو ایسی طرح کرو کہ کسی نہ کسی طرح دیر لگے - مرو بھی دیر سے -

---

اگر تم ہر طرح سے مکمل ہونا چاہتے ہو تو ابتدا اسی شروع کرو یعنی اچھے ماں باپ بہن بھائی، نیک ہمسائے، دیانتدار منتی حاکم صحت دولت سب کا دنیا میں حاصل ہونے سے پہلے انتظام کر لو اور پھر یہ شاید ممکن ہو کہ شادی سے پہلے پہلے تم کسی کسی وقت تھوڑا سا خوش رہ سکو -

فلک پیما

جرمنی میں مدارس کی زندگی

جرمنی میں تمام مدارس کا انتظام حکومت خود کرتی ہے اور گزشتہ ایک صدی سے خود ہی کرتی رہی ہے۔ غیر سرکاری مدارس چند گنتی کے ہیں اور انہیں بھی کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ جرمنی میں اقامتی مدارس نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ قدیم ترین اور مشہور ترین ثانوی مدارس میں بھی اقامت کا طریق رائج نہیں۔

مدارس عموماً دو قسم کے ہیں، ابتدائی مدارس اور ثانوی مدارس۔ ہر جرمن بچے کو اپنی عمر کے چھٹے سے دسویں سال تک ابتدائی مدرسے میں رہنا پڑتا ہے۔ اگر اُسے ثانوی مدرسے میں داخل ہونا ہو تو ابتدائی مدرسے کو وہ چار سال کی حاضری کے بعد چھوڑ دیتا ہے ورنہ چودہ سال کی عمر تک وہیں رہتا ہے۔ باقاعدہ تعلیم کے تین گھنٹوں کے بعد بچوں کو بہت سی اور باتیں بھی سکھائی جاتی ہیں، جن میں انگریزی زبان اور بعض اوقات اسپرانتو شامل ہوتی ہیں۔ جب جرمن بچہ ابتدائی مدرسے کی تعلیم حاصل کر چکتا ہے تو اُسے فارغ نہیں کر دیا جاتا بلکہ اُسے اور چار سال تک ایک مدرسے میں ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ حاضر ہونا پڑتا ہے۔ ان مدارس کا بڑا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کو اس پیشے کے لئے تیار کیا جائے جو وہ اختیار کرنے والے ہوں۔

ثانوی مدارس کی لڑکوں کے لئے سات اور لڑکیوں کے لئے بھی سات بڑی بڑی قسمیں ہیں۔ قدیم ترین اور سب سے زیادہ رائج "جمنیزیم" ہے۔ یہ مدارس کلاسیکی تعلیم دیتے ہیں، یعنی جرمن زبان اور دوسرے مضامین کے ساتھ ساتھ یونانی اور لاطینی زبانیں بھی سکھاتے ہیں۔ تقریباً باقی تمام مختلف قسم کے مدارس اپنے نام کے ساتھ "حقیقی" کا لفظ سابقہ کے طور پر لگا لیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صرف علوم ہی نہیں سکھائے جاتے بلکہ اُن کا عملی سبق بھی دیا جاتا ہے۔ اکثر مدارس میں غیر زبانوں میں سے انگریزی زبان کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کے بعد فرانسیسی، لاطینی اور ہسپانوی زبان کا درجہ ہے۔ جو طلبہ ریاضی اور سائنس پڑھنا چاہیں اُن کے لئے بھی خاص مدرسے ہیں جہاں صرف دو غیر ملکی زبانیں سکھائی جاتی ہیں جن میں سے ایک انگریزی ہوتی ہے۔ لڑکیوں کے لئے بھی اسی طرح کئی قسم کے مدرسے قائم ہیں۔ جرمنی کے مدرسوں میں خاص ٹوپیاں اور خاص لباس پہننے کا رواج نہیں ہے۔ لیکن

بعض مدرسوں کے بچے ایسی ٹوپیاں پہنتے ہیں جن کے رنگ سے اُن کی جماعت کا امتیاز ہو سکتا ہے۔

کھیل ۔ چونکہ جرمن مدرسوں میں تعلیم صرف صبح کے گھنٹوں میں دی جاتی ہے اور ایک یا دو بجے تک اسباق جاری رہتے ہیں اس لئے کھیلوں کے لئے کچھ زیادہ وقت نہیں بچتا ۔ یہی وجہ ہے کہ روزانہ ورزش کی اہمیت کو جرمنی نے ابھی نہیں پہچانا ۔ جسمانی ورزش کی باری ہر دوسرے روز آتی ہے لیکن بہت سے طالب علم ہر روز تیسرے پہر اپنے طور پر ورزش کرتے ہیں ۔ سب کھیلوں سے زیادہ فٹ بال اور ہینڈبال کو پسند کیا جاتا ہے ۔ لیکن خاص جرمن کھیلوں میں بھی بہت دلچسپی لی جاتی ہے ۔ اس کے علاوہ چونکہ درس تدریس صرف صبح کے وقت ہوتی ہے اس لئے جرمن مدرسوں میں جمعرات اور ہفتہ کے دن چھٹی نہیں ہوتی جیسا کہ ہم عام طور پر انگریزی مدرسوں میں دیکھتے ہیں ۔

جرمنی میں مدارس کی زندگی اس لحاظ سے قابلِ تعریف ہے کہ وہاں خرچ بہت کم ہوتا ہے ۔ بچے کو اپنی گرہ سے اپنی تعلیم کے اخراجات کا صرف تیسرا حصّہ ادا کرنا پڑتا ہے اور اس کی میزان فی الحال بارہ پونڈ سالانہ ہوتی ہے ۔ باقی دو تہائی حکومت ادا کرتی ہے ۔ جن والدین کے دو یا تین بچے مدرسے میں پڑھتے ہوں انہیں پہلے بچے کی تو پوری فیس دینی پڑتی ہے لیکن باقیوں کی بہت کم ، مثلاً دوسرے بچے کی نصف ۔ اس کے ساتھ ہی کئی ایک وظائف بھی ملتے ہیں ، چنانچہ بہت سے طلبا کو اپنی گرہ سے کچھ بھی نہیں دینا پڑتا یا اپنے اخراجات کا بہت ہی تھوڑا حصّہ ادا کرنا پڑتا ہے ۔ ابتدائی مدارس میں قطعاً کوئی فیس نہیں لی جاتی اور بعض حالات میں تو کتابیں بھی مفت دی جاتی ہیں ۔

جرمنی میں چھ اور چودہ سال کی عمر کے درمیان مدرسے کی حاضری لازمی ہو جاتی ہے ۔ جو لڑکا کسی فوقانی مدرسے سے فارغ التحصیل ہونا چاہے اسے اٹھارہ یا انیس سال کی عمر تک مدرسے میں رہنا پڑتا ہے آخر میں وہ ایک امتحان میں بیٹھتا ہے جو انگلستان کی طرح یونیورسٹی میں نہیں ہوتا بلکہ اُسی سکول میں ہوتا ہے جسے وہ چھوڑ رہا ہو ۔ اس امتحان کے بعد اسے ہر جرمن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کا حق ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ یہ آخری امتحان خاصا مشکل ہوتا ہے ۔ تمام مضامین میں یہ کچھ تحریری ہوتا ہے اور کچھ زبانی ، اور کئی دن تک رہتا ہے ۔ ہر سال بیس ہزار سے زائد لڑکے اور لڑکیاں اس امتحان کو پاس کرتی ہیں ۔

جرمن مدرسوں میں انگلستان کی نسبت بہت کم اُستانیاں ہیں ۔ بعض اوقات تو لڑکیوں کے مدرسے میں بھی ان کی اقلیت ہوتی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی حال ہی میں عورتوں کو یونیورسٹی میں داخل ہو کر خاص امتحانات میں شامل ہونے کی اجازت ملی ہے لیکن اُستانیوں کی تعداد سُرعت سے بڑھ رہی ہے ، خصوصاً اس لئے کہ عورتوں نے اصرار کیا ہے کہ لڑکیوں کے مدارس میں اُستانیوں کی تعداد زیادہ ہونی چاہئے ۔

مطالعہ اور ڈین انجی

ڈاکٹر ڈین انجی نے ایک دعوت کے موقع پر گفتگو کے دوران میں کہا کہ قدیم لوگ زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے لیکن رومی زیادہ تر اُونچی آواز سے پڑھتے تھے۔ اب بعض لوگ بہت زیادہ پڑھتے ہیں، جیسے کہ بعض بہت زیادہ باتیں بھی کرتے ہیں۔ جلدی پڑھنا ایک ایسی ہی عادت ہے جیسے شراب نوشی۔ اس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ کوئی بات دماغ میں نہیں ٹھیرتی۔

انہوں نے بلند آواز سے پڑھنے کی تعریف کی اور کہا کہ شعر تو ایک ایسی چیز ہے کہ یہ بنا ہی بلند آواز سے پڑھنے کے لئے ہے۔ اُن کا ایک اور قیمتی مقولہ یہ ہے کہ پڑھنے کے دوران میں وقتاً فوقتاً ٹھیر جانا چاہیئے تاکہ جو کچھ پڑھا ہے اس پر غور کیا جا سکے۔ انہوں نے کہا کہ بعض نوجوان سارا سارا دن پڑھتے رہتے ہیں، یہ سخت غلطی ہے۔ کوئی شخص سات گھنٹے سے زیادہ دماغی کام نہیں کر سکتا۔

اخبارات کا سب سے بڑا فائدہ اُنہوں نے یہ بتایا کہ لوگ انہیں ٹرینوں میں پڑھتے ہیں اور اس سے اُن کی باتیں رُک جاتی ہیں۔ پھر اُنہوں نے کہا کہ گاڑی کے بعض درجوں میں حقہ پینے کی اجازت ہوتی ہے اور بعض میں نہیں ہوتی۔ اس کی بجائے بہتر ہو اگر بعض درجوں میں بولنے کی اجازت دی جائے اور بعض میں ممانعت کر دی جائے۔

تصاویر

خضرِ راہ۔ یہ خوبصورت سلہویٹ فوٹوگراف جناب شہاب الدین رحمت اللہ صاحب کی فن کاری کا نمونہ ہے جسے اُنہوں نے خاص طور پر سر اقبال کی نظم "خضرِ راہ" کے لئے تیار کیا۔ ہم اُن کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اسے "ہمایوں" میں شائع کرنے کے لئے مرحمت فرمایا۔

جدید مصری صناعی کا ایک نمونہ۔ یہ سکندریہ کے محل میں تخت کے کمرے کا اندرونی نقشہ ہے جسے مصری وقف کے ماہرینِ تعمیر نے بنایا۔

خضرِ راہ

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر
گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب

شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب!

جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار
موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب

رات کے افسوں سی طائر آشیانوں میں اسیر
انجمِ کم ضو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب

دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما خضر
جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب

کہہ رہا ہے مجھ سی اے جویائے اسرارِ ازل
چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب

اقبال

خضر زاد

CALCUTTA
ART PG WORKS,
LAHORE.

جدید عصری صنعت کا ایک نمونہ
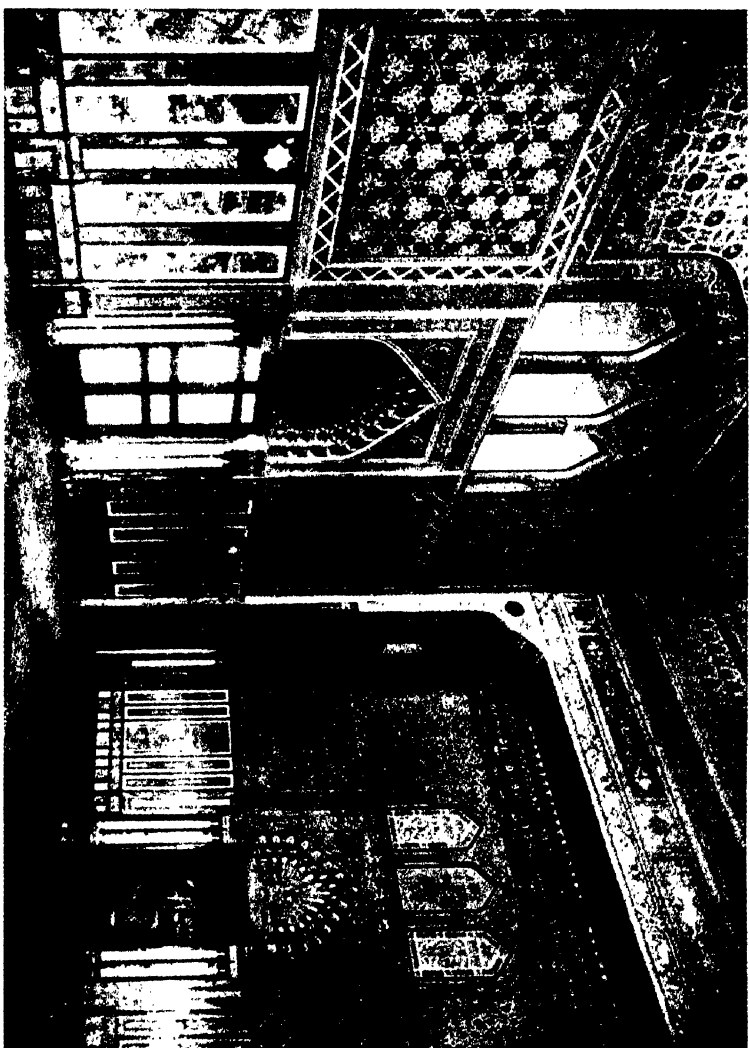
ترکی، آرمینیا اور مصر

جنگِ عظیم کے بعد کی ترقیات پر ایک امریکن کا تبصرہ

جنگِ عظیم جس معاشرتی تباہی کا باعث ہوئی اُس سے مشرقِ قریب سے بڑھ کر دنیا کا کوئی حصّہ متاثر نہیں ہوا، اور اس کے اختتام کے بعد کم ایسے ملک ہوں گے جہاں معاشرتی انقلاب اِن ملکوں سے زیادہ سُرعت کے ساتھ برپا ہوا ہو۔ آرمینا، ترکی اور مصر کے معاملے میں اس موضوع پر بحث بہ یک وقت آسان بھی ہے اور مشکل بھی آسان اس لئے کہ انقلاب ایک امرِ صریح ہے، اور مشکل اِس لئے کہ جن مقامات میں قدیم دستور و آئین اپنی طاقت کھو بیٹھے ہیں اور نئے دستور و آئین ابھی زیرِ تعمیر ہیں انقلاب کا اندازہ لگانے کے لئے معیار قائم کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ اِن تینوں ملکوں میں تبدیلی کا درجہ مختلف ہے۔ تاہم سیاسی، معاشی اور تمدنی پہلوؤں سے اگر مقابلہ کیا جائے تو مطابقت اور اختلاف کی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔

آرمینا دراصل سوویٹ کی اشتراکی جمہوریات کے انبار میں ایک چھوٹی سی اکائی ہے۔ جمہوریہ جارجیا اور جمہوریہ آذربیجان کے ساتھ یہ بھی ایک کاکیشیا پار کی سوویٹ وفاقیہ ہے جس کا اُن بہت سی دوسری قوموں سے جو سب کی سب سوویٹ کے جھنڈے تلے متحد ہو چکی ہیں ایک قریبی رشتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آرمینا اور تُرکی و مصر کے درمیان بڑا اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔

جنگ سے پہلے لفظ آرمینا دو غیر متصل علاقوں کے لئے استعمال ہوتا تھا اور اس کی کوئی الگ حیثیت نہ تھی۔ سلطنتِ عثمانیہ کے مشرقی صوبے اور جنوبی وسطی اناطولیا کے علاقہ سلیشیا میں ارمنی بہت زیادہ تعداد میں آباد تھے۔ یہی رقبے عام طور پر آرمینا کہلاتے تھے۔ موجودہ ارمنی سوویٹ جمہوریہ اُس کشمکش کا نتیجہ ہے جو سنہ ۱۹۲۰ء میں کاکیشس میں برپا ہوئی۔ اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ء کا وہ معاہدہ جو تین کاکیشیا پار کی جمہوریات اور ترکی کے درمیان ماسکو کی زیرِ نگرانی ہوا آرمینیا کے علاقے کو مشخص کرتا ہے اور ترکی سے آرمینیا کے وجود کو تسلیم کراتا ہے۔ لیکن یہ علاقہ جنگ سے قبل کے ارمنی علاقے کے دسویں حصّے سے بھی کم ہے اور اُس کا پانچواں حصّہ بھی نہیں جو معاہدۂ سیورے کے موقع پر ولسن صدر جمہوریہ امریکا نے تجویز کیا تھا۔ یہ ایک خود مختار ارمنی ریاست

قائم کرنے کی کوشش تھی جسے ترکی نے منظور نہ کیا۔

آرمینیا کی اندرونی سیاسی زندگی کے متعلق دو اہم باتیں ہیں۔ اوّل مقامی حکومت اور ماسکو کے درمیان تقسیم اختیارات، اور دوسرے سوویٹ کی اہمیت۔ پانچ ایسے شعبے ہیں جو اتحادی حکومت کے ماتحت ہیں اور وہ یہ ہیں: معاملاتِ خارجہ، مدافعت، غیر ملکی تجارت، ریل، آمد و رفت اور ڈاک اور تار۔ اِس کے بعد محنت، مال، مزدوروں اور کسانوں کا معائنہ، اندرونی تجارت اور مقامی اقتصادیات اِن پانچ شعبوں میں آرمینیا ایک اتحادی جمہوریہ کی حیثیت سے اپنی ایک الگ آواز رکھتا ہے، جسے اتحادی حکومت کی مدد اور نگرانی میسر ہے۔ مقامی حکومت کے معاملات مثلاً زراعت، عدالت، تعلیم، حفظانِ صحت اور رفاہِ عامہ میں جمہوریہ کو مطلق العنانی کا درجہ حاصل ہے۔ سوویٹ ذرائع پیدا وار کی کونسل ہے۔ یہ ذرائع کیا ہیں؟ دیہات میں گاؤں اور شہر میں کارخانے۔ ان کونسلوں کا انتخاب مزدور لوگ کرتے ہیں، خواہ وہ زراعت سے تعلق رکھتے ہوں یا صنعت سے۔ بعض طبقے جنہیں نظامِ جمہوریہ کی رو سے سیاسی حقوق حاصل نہیں شامل نہیں کئے جاتے۔ اس زمرے میں یہ لوگ ہیں پادری تاجر، وہ جو دوسروں کو نوکر رکھتے ہیں یا ایسی آمدنی پر گزران کرتے ہیں جسے خود اُنہوں نے نہ کمایا ہو، اور وہ جو زار کی حکومت سے تعلق رکھتے تھے۔ گاؤں یا قصبے کی مقامی سوویٹیں ضلع کی سوویٹوں کے لئے نمائندے منتخب کرتی ہیں اور یہ صوبے کی سوویٹوں کے لئے اور پھر مؤخرالذکر کے نمائندے کُل روسی کانگریس میں بھیجے جاتے ہیں۔

آرمینیا تو ایک سوویٹ جمہوریت ہے مگر ترکی ایک خود مختار مملکت ہے جو سوائے اُن امور کے جن میں اس نے ۱۹۲۳ء سے خود اپنی مرضی سے بعض پابندیاں اپنے اوپر عائد کر لی ہیں ہر بیرونی اقتدار سے آزاد ہے۔ ترکی کی خود مختاری نتیجہ ہے اُس فتح کا جو ۱۹۲۲ء میں اسے اناطولیا میں یونانی افواج پر حاصل ہوئی اور معاہدۂ لوزان میں اُس کامیاب مطالبے کا جو اُس نے اپنی حیثیت کو تسلیم کرانے کے لئے پیش کیا۔ مصطفیٰ کمال کا نئی ترکی کا تصور ایک مطلق العنان اور آزاد مملکت تھی۔ اِس مطمحِ نظر کے حصول کے لئے دو باتیں ضروری تھیں: سلطنتِ عثمانیہ کے پُرانے ادارات کا انسداد اور اُن کے بجائے نئے ادارات کی تعمیر۔ پُرانے ادارات کے انسداد کے سلسلے میں ۱۹۲۲ء میں سلطنت کا خاتمہ ہوا اور اس کے بعد ۱۹۲۴ء میں خلافت بھی رخصت ہوئی اور ترکی نے ایک قومی مملکت کی تعمیر میں اپنی توجہ کو مرکوز کرنے کے لئے عالمِ اسلام کا رہنما بننے سے انکار کر دیا۔

اکتوبر ۱۹۲۳ء میں جمہوریہ کے اعلان نے عمومیّت کا مغربی سیاسی تصوّر کم از کم کہنے کو پورا کر دیا۔ اور جب

۱۹۲۴ء میں دستور اختیار کیا گیا تو ایک مستحکم حکومت کی بنیاد پڑ گئی۔ مطلق العنان قوم کی قوم ہے مگر اختیار صرف ایک نمائندہ مجلس کے ہاتھ میں ہے جو تمام قانونی اور انتظامی معاملات کی مالک ہے۔ ایک برائے نام صدر ہے اور ایک کابینہ بنائی گئی ہے جسے مجلس وزرا کا اعتماد حاصل ہونا چاہیے۔

کچھ کم حیرت انگیز لیکن کچھ زیادہ قابل ذکر ترکی میں نئے قوانین کا رواج تھا۔ اس معاملہ میں ترکی نے مغربی یورپ کی اقوام سے بہت کچھ مستعار لیا۔ فروری ۱۹۲۶ء میں دیوانی ضابطہ سوئٹزرلینڈ کے ضابطے کے اصول پر تیار کیا گیا جو یورپ بھر میں جدید ترین اور عمومیہ پسندی کے نقطۂ نظر سے بہترین تھا۔ مزید برآں اس کا اطلاق کامیابی کے ساتھ ایک ایسے ملک پر ہو چکا تھا جس میں تین مختلف النسل قومیں آباد تھیں اور اس لئے ترکی کی ضروریات کے لئے موزوں معلوم ہوتا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد فوجداری قانون بنا جس کا نمونہ اطالوی ضابطہ تھا۔ جرمن تجارتی ضابطہ جوں کا توں اختیار کر لیا گیا، پھر جولائی ۱۹۲۷ء میں ایک نئے ضابطۂ دیوانی کا اعلان ہوا جس کو ترک ماہرین قانون نے مغربی یورپ کے مشہور علما کے مشورے سے تیار کیا۔ غرضکہ یوں قانونی اور سیاسی سطح کو جدید معیار کے مطابق بلند کیا گیا۔

مصر

اُدھر ترکی اپنے آپ کو ان بندھنوں سے آزاد کر رہا تھا اُدھر مصری قوم پرست برطانی عملداری سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ۱۹۲۲ء میں برطانی حمایت کے اختتام کے نتیجے کے طور پر اور مصری آزادی کے اعلان پر ملک کو اندرونی معاملات میں پورا اختیار حاصل ہو گیا۔ ۱۹۲۳ء میں ایک دستور منظور ہوا، اور اعلان ہوا کہ مصر ایک خود مختار مملکت ہے اور اس کی حکومت ایک وراثتی بادشاہت ہے جو رسمی طور پر ملک کی نمائندہ ہے۔ لیکن خود مختاری کے اعلان میں برطانیہ نے چار باتیں اپنے لئے مخصوص کر لیں: مصر میں شاہی نامہ و پیام کی حفاظت، مدافعت، غیر ملکی مفاد اور اقلیتوں کی حفاظت اور سوڈان کا قبضہ۔ مصری اقتدار کو اِن باتوں نے بہت بڑی حد تک محدود کر دیا۔ چنانچہ ہر طبقے کے مصری سیاسوں نے اِن پابندیوں سے آزاد ہونے کی کوششیں کی ہیں۔

سیاسی حیثیت سے کتنے بھی مختلف کیوں نہ ہوں آرمینیا، ترکی اور مصر میں ایک بات مشترک ہے: ہر ایک کے باشندے زیادہ تر زراعت پیشہ ہیں۔ آرمینیا کی آبادی ۸۷۶۰۰۰ نفوس ہے، جن میں سے تقریباً پچاسی فیصدی زراعت کرتے ہیں۔ ترکی کے ۱۳۰۰۰۰۰۰ نفوس میں سے تقریباً ۹۲۰۰۰۰ کسان ہیں۔ مصر کے ۱۸۰۰۰۰۰۰ میں سے ۱۴۰۰۰۰۰۰ فلاحین میں شمار کئے جاتے ہیں۔

خاص طور پر دلچسپ پہلو ترکی زبان کو لکھنے کے لئے عربی رسم الخط چھوڑ کر لاطینی رسم الخط کا رواج تھا۔

مصر اور اسلام

مصر کی تمدنی و معاشرتی حالت کو بیان کرنے کے لئے یہاں جگہ نہیں ہے۔ غالباً اسی قدر کہنا کافی ہوگا کہ حکومت نے اس طرف جو قدم بڑھایا وہ نہ تو اُتنا شدید تھا اور نہ اُس قدر مغربی اصول کے مطابق جس کی مثال ہمیں آرمینیا اور ترکی میں ملتی ہے۔ شاید اس امر سے اس کی توجیہ ہو جاتی ہے کہ برطانی نگرانی کے تحت کم ازکم ایک دو جماعتی سیاسی نظام کی صورت قائم رہنے کا امکان پیدا ہوگیا۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ ترقی ایک معمولی عمل ہے جو دو مخالف نقاطِ نظر کے درمیان رضامندی سے پیدا ہوتا ہے، اور کہیں اوپر سے نازل نہیں ہوتا۔ مصر پر اب تک اسلام کی حکومت ہے۔ اس کی بنیادیں وہاں مضبوط ہیں اور ایک معاشرتی نظام کی حیثیت سے اس کی اہمیت کا وہی عالم ہے جو ترکی میں وینیزِ ستمبر دَاری سے پہلے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نسوانی مساوات کی تحریک کی رفتار یہاں ترکی کی بہ نسبت نہایت سست ہے اور تعلیم عامہ پر بھی اُتنا زور نہیں دیا جاتا۔ مگر تاہم اقلیتوں کو اپنے اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی ہے اور قانونی حفاظت حاصل ہے۔ غرضیکہ تمام بالغ شہری (مرد) اپنے سیاسی حقوق کے معاملہ میں آزاد ہیں۔

مستقبل

اِن ممالک کے باشندوں کا مستقبل کیا ہے؟ کیا یہ باتیں فرد کی ترقی کی سطح کو عام طور پر بلند کر دیں گی؟ یہاں انسان کو معیاروں کا معمّا پیش آجاتا ہے۔ وہ کونسا معیار ہے جس سے ہم اس تہذیبی ترقی کو ناپ سکتے ہیں؟ تینوں ملکوں میں پُرانے ادارات کی اب وہ صورت نہیں رہی جو جنگ سے پہلے تھی، بلکہ انہیں مغربی انداز میں نئی شکلیں دی جارہی ہیں۔ آرمینیا میں نئے تعلق نے ایک ردِ عمل پیدا کر دیا جس کے بعد جزوی تقلید پیدا ہوئی۔ ترکی میں تقلید حقیقی اور کامل طور پر عمل میں آئی۔ مصر کا عمل موافقت پر ہے۔ مگر جب یہ سچ ہے کہ مغرب کو خود اپنی تہذیب کے متعلق شکوک پیدا ہونے لگے ہیں تو یہ بالکل ممکن ہے کہ وہ ادارات جو صنعت زدہ مغرب میں اب تک اپنی نفع رساں قوت کے باعث زندہ ہیں مشرق میں جو ابھی زراعت پیشہ ہے، اختیار کئے جائیں اور مفید نتائج پیدا کریں۔ بہ اُس تہذیب سے پیدا ہوئے تھے جو کبھی دیہاتی اور زراعتی تھی اور اب شہری اور صنعتی بن چکی ہے۔ عقلاً اس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ یہ ادارات کیوں دوسری دفعہ استوار نہ ہو جائیں گے اور ان سے لوگوں کو کیوں مادی فوائد حاصل نہ ہونگے۔

وہ مواقع کیا ہیں جو اگر حاصل ہوئے تو عام ترکوں کو گذشتہ کی بہ نسبت ایک بلند معیار زیست کے حصول میں مدد دیں گے ! اگر کچھ دیر تک امن رہا ، اگر قوموں کا دوسری قوموں کی طرف ہمدردانہ اور رواداری رویہ رہا ، اگر قوم ایک جوش کے ساتھ باہمی امداد پر عامل رہی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ حالات بہتر ہو جائیں گے اور مستقبل میں ترکی کی تہذیب و ترقی کی سطح بلند ہو کر رہے گی ۔

باقی رہا آرمینیا ، اُس کا کامل خود مختاری کا مقصد ابھی حل نہیں ہوا ۔ فی الحال اُسے ایک معلّق حالت میں رہنا ہے ۔ اور اگرچہ اُس نے اشتمالیت اور دہریت کو اپنے لئے انتخاب نہیں کیا تاہم اُسے امن و سکون اور ہر عقوبت سے آزادی حاصل ہے ۔ مقامی حکومت کے معاملات میں وہ مطلق العنان ہے اور سرحدوں کی حفاظت کے اخراجات سے بڑی حد تک بے فکر ہے چونکہ دنیا کی کوئی حکومت عوام کی معاشرتی ترقی کی ضرورت کا خیال کرنے میں مستعد نہیں ہوتی اس لئے قطعاً یہ ماننا پڑے گا کہ سوویٹ جمہوریۂ آرمینیا کے لوگ گذشتہ کی بہ نسبت آئندہ زیادہ خوش حال ہوں گے ۔

مصر کے متعلق کچھ کہنے کے لئے محتاط رہنا پڑتا ہے ۔ یہ کوئی سوال نہیں ہے کہ وہ ایک ملک کی حیثیت سے خوش حال ہے یا نہیں ۔ لیکن آبادی کے صرف بعض طبقے ایسے ہیں جن میں یہ خوش حالی کسی سودمند صورت میں نظر آ رہی ہو ۔ ترقی و بہبود کا بہت سا انحصار اُس بات چیت کے نتیجے پر ہے جو محفوظ شعبوں کے متعلق انگلستان سے ہو رہی ہے ۔ اگر نتیجہ مصری مطالبات کی فتح ہوا تو سیاسیوں اور تعلیم یافتہ طبقوں کی توجہ بلاشبہ ملک کی معاشرتی ترقی کی طرف ہو جائے گی ۔ اگر برطانیہ نے مصر کے مطالبات کو رد کر دیا تو اندیشہ ہے کہ ملک کے بہترین دل و دماغ ایک لاحاصل اور عبث سیاسی کشمکش میں مصروف ہو جائیں ۔

منصور احمد

اے قیمتی شامو ! جو سب کی سب آن کی آن میں بیت چکیں ۔

پہلی بچی شام ، اپنی ماں کو راہ دکھاتی ہوئی !

محبت راتوں کی تاریک دنیا کو پُر نور بنا سکتی ہے ۔

گلچیں

معبد کا دروازہ

وقت کبھی گزرا ہی نہیں، ہاں ہم گزریں تو گزریں
ایک طرف ہے ازل کا پایہ، ایک طرف ہے ابد کا
بیچ میں وقت کھڑا ہے
اک آغاز سراسر ہے یا اک انجام سراپا
وقت گزر سکتا ہی نہیں ہاں ہم گزریں تو گزریں
وقت خدا کا دل ہے!
اس میں ہے محفوظ سبھی کچھ
گزری باتیں گزر نہیں سکتیں
گزرا وقت گزر نہیں سکتا
وقت خدا کا دل ہے!

اسے جو مجھ سے جُدا ہے!

کیوں رووُں میں، جاں کھوؤں میں اب بھی زمانہ وہی ہے
رنگِ زمانہ وہی ہے۔
برسوں پہلے ہم نہ جُدا تھے
کیا یہ خوشی کچھ کم ہے
برسوں پہلے نہ ہم تنہا تھے
اب بھی وہی عالم ہے
گزرا زمانہ گزر نہیں سکتا، گزری باتیں وہی ہیں
گزرا زمانہ وہی ہے۔

آج مری آنکھوں کے آگے ہے وہ پُرانا معبد
آج بھی شام وہی ہے
جب معبد کے دروازے سے ہم دونوں نکلے تھے

فارغ ہو کے دعا سے

تُو اور میں دونوں نکلے تھے

مجھ سے زمانہ چھین لے تجھ کو

تجھ سے زمانہ چھین لے مجھ کو

یہ دولت اب چھن نہیں سکتی

تُو اور میں دونوں نکلے تھے

معبد کے اُس دروازے سے

جس نے تیرے نقشِ پا سے جلوۂ خُلد دکھایا

جس نے تیری پاک قدم سے قدس کا رتبہ پایا

جس کو تیری محبت نے گہوارۂ نور بنایا

یہ دروازہ ابیں ہے اب بھی میری اِس دولت کا

یہ دولت اب چھن نہیں سکتی

معبد کے اُس دروازے سے

تُو اور میں دونوں نکلے تھے

فارغ ہو کے دعا سے

میری دولت یوں ہی رہے گی

گو میں خود مٹ جاؤں

میری امانت یوں ہی رہے گی

گو صدیوں کی طوالت

اِس در کو بھی مٹا دے

گزری باتیں گزر نہیں سکتیں ہم گزریں تو گزریں

میری امانت یوں ہی رہے گی

میرے خدا کے دل ہیں

یہ دولت اب چھن نہیں سکتی گو سب کچھ چھن جائے

"اِک معبد کے دروازے سے

"تُو اور میں دونوں نکلے تھے

"فارغ ہو کے دعا سے"

حامد علی خاں

غزل پر ریزہ خیالی کا الزام

غزل کا اعجاز نما اختصار ۔ وہ غزل سرائی جس نے حافظ کو لسان الغیب، سعدی کو بلبل شیراز خسرو کو طوطیٔ ہند بنا دیا تھا اور میر کے نشتر، غالب کے تیر نیمکش، مومن کے انداز، آتش کے سوز و ساز، امیر و داغ کے ناز دنیا کا رنگ جما یا تھا" آج مغرب زدوں کے نزدیک ہدف ملامت بنی ہوئی ہیں۔ اس پر بیسیوں قسم کے سہل اعتراضات کئے جاتے ہیں، بلکہ بعض مقلدین یورپ کے حلقوں میں کوشش جاری ہے کہ اس کا نقش قدم بھی مٹا دیا جائے لیکن یہ سعی آج تک نامشکور ہی رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی ۔ جدید شاعری کے حامیوں کے نزدیک غزل کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ اس میں کسی معاملہ یا واردات کا مسلسل بیان نہیں ہوتا۔ غزل کا ایک شعر دوسرے شعر سے کوئی تعلق نہیں رکھتا بلکہ ہر شعر میں کوئی منفرد خیال یا واقعہ بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس بنا پر بعض لوگ دفتر غزلیات کو اہمل اور بے جوڑ مضامین کا انبار قرار دیتے ہیں اور بعض اس پر ریزہ خیالی اور پراگندہ گوئی کی پھبتی اڑاتے ہیں۔ اُن کے نزدیک مسلسل گوئی شاعری کا جزو لاینفک ہے۔ بعضوں نے تسلسل جذبات کے فقدان کی بنا پر غزلیات کی توہین و تحقیر میں اس قدر غلو و مبالغہ سے کام لیا ہے کہ خود اُن کا مذاق سلیم معرض خطر میں پڑ گیا ہے۔

حقیقت الامر یہ ہے کہ بسا اوقات غزل کے ہر شعر میں ایک نئے مضمون یا نئے واقعے کا بیان ہوتا ہے۔ اگر شاعر چاہے تو اسی مضمون کو چالیس پچاس اشعار میں پھیلا کر ادا کر سکتا ہے لیکن یہ کوئی تعریف کی بات نہ ہو گی۔ کمال تو اسی میں ہے کہ دریا کو کوزہ میں بند اور دفتر معنی کو صرف ایک سطر میں ادا کیا جائے۔ غزل کا اختصار ایجاز نہیں بلکہ اعجاز کہلاتا ہے۔ فصاحت و بلاغت کا کمال اختصار و ایجاز کا متقاضی ہے نہ کہ تفصیل و اطناب کا۔ اسی لئے جوہریان معنی و واقفان رموز بلاغت غزل کو تمام اصناف سخن میں سب سے زیادہ ادق تصور کرتے ہیں۔ منشی امیر احمد علوی کا خیال نہایت صحیح ہے کہ "اساتذہ کے دواوین کے اکثر اشعار یا تو کسی طول طویل واقعے کا خلاصہ یا کسی جوش و خروش کی مختصر روداد یا کسی عظیم الشان جذبے کے چھوٹے پیمانے کی تصویر یا کسی اخلاقی مسئلہ کا حاصل ہوتے ہیں۔ وہ چند الفاظ میں اُن تمام کیفیات و واقعات اور خیالات و جذبات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جن پر شیکسپیر اور بائرن کو جداگانہ مستقل کتابیں تصنیف کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی" اس قول کا آخری فقرہ مبالغہ آمیز ضرور ہے لیکن حصۂ اول کی صداقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ براؤننگ اپنی فلسفیانہ نظموں کے

لئے بہت مشہور ہے لیکن جن نکات کو وہ طویل نظموں میں بیان کرنے سے قاصر تھا انہیں ہمارا باکمال غزل گو شاعر صرف ایک شعر میں ادا کر کے سامعین پر وجد و سرور کی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ چنانچہ مرزا غالب کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

شعر کیا ہے، معانی کا قلزم، تصوف کا دریا، موسیقی کا سرچشمہ، روح پرور نغمہ کا ساز، اور افلاطون کے نظریۂ انعکاس کا زندہ مجسمہ ہے۔ اس شعر کی نسبت مرزا محمد عسکری فرماتے ہیں کہ "جس طرح ایک عمدہ ترشا ہوا نگینہ اپنے مختلف پہلوؤں سے عجیب پر لطف طریقہ سے ضیا بار ہوتا ہے یا حکاکوں اور سادہ کاروں کی اصطلاح میں "چھوٹ دیتا ہے" اسی طرح یہ شعر کسی ایک معنی پر ہمارے خیال کو جمنے نہیں دیتا جب ایک معنی سے قلب و دماغ مطمئن ہو جاتا ہے اور لطف اٹھانے لگتا ہے تو فوراً دوسرے معانی جو پہلے سے بھی بہتر و خوشتر ہوتے ہیں ہمارے سامنے آجاتے ہیں اور ہم اُن سے حظ اٹھانے لگتے ہیں" شاعر کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ کسی خیال، واقعے یا جذبے کی محدود و معین تصویر پیش نہ کرے بلکہ ایسا اسلوب بیان اختیار کرے جس میں اس خیال یا جذبے کی مختلف حالتوں اور کیفیتوں کی طرف اشارہ پایا جائے اور ان کی دلکش تصویریں سننے والے کی چشم تخیل کے سامنے یکے بعد دیگرے گزرنے لگیں۔ تمام اصناف سخن میں سب سے زیادہ اشارتی و ایمائی (Suggestive) قوت غزل ہی کے اشعار میں پائی جاتی ہے۔ الغرض دریا کو کوزہ میں بند کرنا غزل گوئی کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ اشعار غزل کا ظاہری اختصار فی الحقیقت بحر معنی سے ہم آغوش ہوتا ہے۔

کثیر المطالب اشعار۔ ایک ناول نگار معشوق کی تعریف اور سراپا نگاری میں صفحے کے صفحے سیاہ کر دیتا ہے لیکن اس کا طویل بیان نہ صرف لطافت و دلکشی کے لحاظ سے بلکہ مضمون و معنی کی وسعت کے اعتبار سے بھی ایک شعر کی جامعیت کو نہیں پا سکتا

حسن بھی مہر و وفا بھی ہے مروت بھی ہے
ناز بھی غمزہ بھی شوخی بھی شرارت بھی ہے

شاعر نے صرف دو مصرعوں میں معشوق کی تمام ظاہری و باطنی خوبیوں کو جس دلپذیر پیرایہ میں بیان کر دیا ہے وہ سر والٹر سکاٹ اور تھیکرے کے قلم جادو رقم کو بھی اعتراف شکست پر مجبور کرتا ہے۔

دنیا کی بے ثباتی، عالم کی نیرنگی، زمانہ کے تغیرات، حکومتوں کے انقلابات، دولت و ثروت کی بے اعتباری اور جاہ و حشم کی ناپائداری پر سیر حاصل نظمیں لکھی جا چکی ہیں۔ حضرت تعشق نے صرف ایک شعر

میں اس کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ چشم بینا کے لئے عبرت و بصیرت کا ایک دفتر ہے - فرماتے ہیں

کاش یہ جمشید کو معلوم ہوتا جام میں
کاسۂ سر کاسۂ دست گدا ہو جائے گا

بہر حال اس قسم کے ہزاروں شعر پیش کئے جا سکتے ہیں جو کسی وسیع خیال یا طویل مضمون کو ادا کرتے ہیں۔ اور جن کا ہر لفظ "گنجینۂ معنی کا طلسم" ہوتا ہے ۔ مثلاً ہم یہاں مرزا غالب کے صرف دو شعر درج کرنے اور علامہ طباطبائی نے اُن کی جو شرح لکھی ہے اُسے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ انہیں دو مثالوں سے واضح ہو جائے گا کہ اُستادانِ فن ایک شعر میں جو وسیع مضمون ادا کر دیتے ہیں اُس کے بیان کرنے کے لئے معمولی شاعروں کو لمبی چوڑی نظمیں لکھنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے ۔ قلیل الفاظ کو کثیر معانی کا حامل بنانا اہلِ کمال ہی کا کام ہے - ہر شخص اس کمان کو زِہ نہیں کر سکتا ۔ بہر حال غالب کا شعر ہے

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اس شعر میں ایک نہایت وسیع مضمون ادا کیا گیا ہے ۔

(۱) حالت یہ ہے کہ ایک بلبل چمن اور آشیاں سے جدا ہو کر گرفتار ہو گئی ہے ۔

(۲) اس نے اپنی آنکھوں سے باغ میں بجلی گرتے ہوئے دیکھی ہے اور قفس میں متردد ہے کہ نہ معلوم میرا آشیانہ بچا یا جل گیا

(۳) ایک اور بلبل جو اس کی ہمصفیر اور ہمدم ہے سامنے کے درخت پر آ کر بیٹھ گئی ہے اور اسیرِ قفس بلبل نے اِس سے رودادِ چمن کو دریافت کرنا چاہا ہے

(۴) مگر چونکہ اس کا آشیانہ جل گیا ہے بلبلِ ہمصفیر مفصل حال کہتے ہوئے پس و پیش کرتی ہے کہ اس آفتِ اسیری میں آشیانے کے جلنے کی خبر کیا سنائیں

(۵) بلبلِ نو گرفتار کے دل میں اگرچہ اس کا کھٹکا ہے تاہم اُس نے اپنے دل کو مطمئن کر لیا ہے کہ باغ میں ہزاروں آشیانے ہیں کیا میرے ہی آشیانے پر بجلی گری ہوگی اِس لئے وہ اپنے ہمصفیر سے رودادِ چمن پوچھتی ہے اور وہ اس کے بیان کرنے میں لیت و لعل کرتی ہے تو کہتی ہے ؎ گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو -

اب اِس حالت کو پیشِ نظر رکھکر اس شعر پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ کس حسن ترتیب کے ساتھ اس کا ایک ایک لفظ ایک وسیع مضمون کو ادا کر رہا ہے۔ بلبل کی تو گرفتاری کی طرف محض "ایک قفس" کا لفظ اشارہ کر رہا ہے۔ اِس مفہوم کو کہ "اُس نے خود چمن میں بجلی گرتے ہوئے دیکھی ہے اور اپنے آشیانے کی نسبت متردد ہے" صرف "کل" کے لفظ سے ادا کیا ہے۔ اِس خیال کو کہ "اس کا ہمصفیر سامنے کی کسی شاخ پر آبیٹھا ہے اور وہ اس سے روداد چمن دریافت کرنا چاہتی ہے لیکن وہ اس کی ہمدردی کے خیال سے اس کے کہنے سے ڈرتا ہے" اِس مختصر فقرہ میں کہ "مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم" ظاہر کیا ہے۔ ان تمام باتوں کے ساتھ اس نے اپنے دل کو مضبوط کر کے جس طرح روداد چمن کو دریافت کرنا چاہا ہے اُس نے اِس مضمون کو کس قدر موثر اور درد انگیز کر دیا ہے۔ یعنی جس گرفتار قفس پر ایک ایسی تازہ آفت اور بلائے آسمانی نازل ہوئی ہے اُس نے کیسا اپنے دل کو سمجھا کر مطمئن کر لیا ہے کہ باغ میں ہزاروں آشیانے ہیں کیا میرے ہی نشیمن پر بجلی گری ہوگی۔ یہ حالت ایسی ہے کہ دیکھنے والوں اور سننے والوں کا دل کڑھتا ہے اور ترس آتا ہے۔ اور یہ ترس آجانا وہی اثر ہے جو شعر نے پیدا کیا ہے۔ اِسی طرح اس شعر میں کہ

غالب ترا احوال سُنا دیں گے ہم اُن کو
وہ سُن کے بُلالیں یہ اجارہ نہیں کرتے

یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ عاشق ایک شخص سے جس کو معشوق کی بزم میں باریابی حاصل ہو خواہش کر رہا ہے کہ مجھے باریابی کی اجازت دلا دو۔ وہ کسی قدر بے پروائی کے ساتھ کہتا ہے کہ ہم کسی نہ کسی موقع پر تمہارا حال تو گوش گذار کر دینگے لیکن کامیابی کا وعدہ نہیں کر سکتے۔ یہ اِس شعر کا صریحی مفہوم ہے۔ لیکن اس سے التزاماً اور بھی متعدد اشارے نکلتے ہیں۔ مثلاً

(۱) یہ کہ درمیانی شخص اس خواہش کے جواب میں کہتا ہے کہ ہم معشوق کے مزاج کو دیکھ کر باتوں باتوں میں یا ہنسی ہنسی میں تمہارا حال کہدیں گے۔ ہم اتنا ہی ذمہ کرتے ہیں یعنی صاف صاف کہنے کی جرأت نہیں رکھتے۔

(۲) اور اِس سے در پردہ معشوق کے غرور، نخوت، رعب، نازک مزاجی اور خود بینی کی طرف بھی اشارہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں صرف ایک فقرے سے ادا ہو جاتی ہیں یعنی یہ کہ "سنا دیں گے ہم اُن کو"۔ اگر اس کے بجائے وہ یہ کہتا کہ "کہدیں گے ہم اُن سے" تو یہ معانی فوت ہو جاتے۔

(۳) عاشق اصرار کر رہا ہے کہ جس طرح ممکن ہو میری یہ خواہش پوری کرا دو اور اس اصرار کو یہ فقرہ ظاہر کر رہا ہے کہ "اجارہ نہیں کرتے"۔ کیونکہ اس قسم کے فقرے اُسی وقت بولے جاتے ہیں جب کوئی نہایت مصر ہو اور کہے

کہ جس طرح بنے میرے اُس کے ملاپ کرادو نہیں تو تم سے شکایت رہے گی۔ غرض کہ اس فقرے نے عاشق کے بے تابانہ اصرار کی تصویر کھینچ دی ہے۔ اس شعر نے نہ صرف دو فقروں میں ایک وسیع خیال اور طویل مضمون کو ادا کر دیا ہے بلکہ کمال تو یہ ہے کہ ادھر معشوق کی تمکنت و ناز اور اُدھر عاشق کی بے تابی و اصرار کی دونوں تصویریں بھی اسی شعر میں سے جھلکی دکھا رہی ہیں۔

یہ دونوں اشعار مثال ہیں اُن بڑے جلیل الشان مسائل کی جو آدابِ کاتب و شاعر میں اہم اُصول مانے گئے ہیں۔ ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ خَیْرُ الْکَلَامِ مَا قَلَّ وَدَلَّ یعنی بہتر کلام وہ ہے جو کم ہو لیکن معانیٔ کثیر پر دلالت کرے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اَلشِّعْرُ کَلَامٌ یَنْقَبِضُ بِہِ النَّفْسُ وَیَنْبَسِطُ یعنی شعر وہ کلام ہے جس سے نفس پر انقباض یا انبساط کی حالت طاری ہو۔ تیسرا مسئلہ جس پر تمام مغربی نقاد متفق الرائے ہیں یہ ہے کہ شعر میں ایمائی قوت Suggestive Power پائی جانی چاہیئے۔ مذکورہ بالا اشعار ان تینوں خوبیوں کے حامل ہیں غزل کے اکثر و بیشتر اشعار میں یہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں۔ باوجود ایجاز و اختصار کے ان کا ہر لفظ ایک وسیع خیال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ تاثیر جو شعر کی جان ہے ان میں بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے۔ جو شعر بذاتِ خود ایک طویل نظم کا قائم مقام ہو، جو اپنے اندر اس قدر کثیر معانی مضمر رکھتا ہو جن کی تشریح کے لئے صفحے کے صفحے درکار ہوں وہ اپنے ماقبل و مابعد کے اشعار سے کوئی ربط و تعلق نہ رکھے تو کیا مضائقہ ہے مسلسل گوئی کی ضرورت تو اُس وقت لاحق ہوگی جب ایک شعر میں کوئی خیال اچھی طرح ادا نہ ہوتا ہو۔ الغرض اشعارِ غزل پر ریزہ خیالی کا الزام حقیقتِ شاعری و اصولِ بلاغت سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ چشمِ بینا کو تو انہیں ریزوں میں دُرِ غلطاں کی دمک اور گوہرِ یکتا کی چمک نظر آتی ہے۔

ایما و اشارہ کی اہمیت۔ ممکن ہے کہ معترضینِ غزل مذکورہ بالا اشعار کو مستثنیٰ قرار دیں اور کہیں کہ غزل کے اشعار عام طور پر ایسے وسیع خیالات کے حامل نہیں ہوتے کہ انہیں طویل مسلسل نظموں کا قائم مقام تصور کیا جائے۔ ان کے نزدیک کسی خیال، جذبے یا واقعے کی تصویر کشی کے لئے دو مصرعے بالکل ناکافی ہیں صرف ایک شعر میں جو مضمون ادا کیا جائے گا وہ لامحالہ ناقص و ناتمام ہوگا۔ اس لئے غزل کے اشعار خیالاتِ منفردہ کی ادھوری ترجمانی کرتے ہیں۔ لیکن یہ اعتراض اصولِ شاعری سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ عام مصوّری اور شاعرانہ مصوری میں بہت بڑا فرق یہی ہے کہ مصوّر جس چیز کی تصویر کھینچتا ہے اُس کا ایک ایک خال و خط کو دکھاتا ہے نہیں تو تصویر ناقص و ناتمام ہوگی لیکن شاعرانہ مصوّری کی حالت اس سے جداگانہ ہے۔ شاعری میں

صرف اُن چیزوں کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے جن سے ہمارے جذبات متاثر ہوں۔ باقی چیزوں کو نظر انداز کر دینا یا دھندلا رکھنا چاہیئے۔ اگر شاعر تمام تفصیلی اور جزئی باتوں کو بیان کرنے لگے تو کلام کی ساری خوبی و تاثیر خاک میں مل جائے شاعری میں تفصیل و ایضاح ہمیشہ سامع کی بیزاری کا باعث ہوا کرتی ہے۔ اوّل تو کسی خیال و جذبہ کی وسعت و ہمہ گیری اور اس کی لامتناہی صورتوں اور کیفیتوں کا احاطہ کرنا اور پھر انہیں صفحہء قرطاس پر منتقل کرنا ہی دشوار امر ہے، لیکن اگر کوئی شاعر بعض امتیازی پہلوؤں کو لیکر ان کے حدود و تعین کرے اور انہیں حدود کے اندر ان کی تحلیل و تجزیہ اور تبویب و تقسیم کی کوشش کرے اور اُن کی تفصیلات و جزئیات کو بیان کرے یا ہر ٹکڑے کا ثبوت ڈھونڈے تو ہم اس خشک و بے اثر کلام کو زیادہ سے زیادہ علم النفس کا ایک منظوم باب یا منطق و فلسفہ کا منظوم و مقفیٰ درس کہہ سکتے ہیں لیکن شاعری سے اس کو دور کی بھی نسبت نہیں ہے۔ بعض مسلسل گوئی کے حامیوں نے اخلاقی مضامین مثلاً دوستی، ہمدردی، اخوت، صبر، قناعت، تواضع علم، حلم وغیرہ پر سیر حاصل نظمیں لکھی ہیں۔ اُن کی نوعیت و ماہیت اور اقسام پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے دینی و دنیوی فوائد تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ مختلف قصوں اور حکایتوں کے ذریعہ سے ان کی توضیح و تشریح بھی کی ہے۔ ان کی محنت قابلِ داد ضرور ہے، وہ بہت بڑے حکیم یا معلمِ اخلاق کہلا سکتے ہیں لیکن یہ مشکوک امر ہے کہ وہ صرف انہیں غیر دلچسپ نظموں کی بنا پر "شاعر" کے لقب سے ملقب کئے جا سکتے ہیں یا نہیں۔ واضح رہے کہ شعر کسی خیال کی اجتماعی کیفیت سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ اس کی تحلیل و تجزیہ سے۔

یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ کسی خیال کو تفصیل کے ساتھ مسلسل طور پر نظم کر دینا ہی شاعری نہیں ہے۔ تسلسل اور تفصیل نثر کے لئے ضروری ہیں۔ نثر کا اقتضا ہے کہ جو مضمون ادا کرنا ہو اُسے وضاحت و صراحت کے ساتھ بیان کیا جائے اور الفاظ کی بندش اور جملوں کی ترکیب ایسی ہو کہ ان سے ایک خاص معین معنی صاف طور پر پیدا ہو، لیکن شاعری میں اس قسم کی تحدید و تخصیص یا توضیح و تشریح کی مطلق ضرورت نہیں۔ بقول چکبست شاعری میں یہ اصول مدِ نظر رکھنا چاہیئے کہ جو مضمون ادا کرنا ہو وہ اختصار کے ساتھ باندھا جائے اور محض ایک حالت کا اشارہ کرے۔ ترکیبِ الفاظ ایسی ہو کہ اس حالت کی مختلف کیفیتیں اور مختلف نقشے پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے گذر جائیں"۔ اسی کو انگریزی میں "سجیشن" کہتے ہیں ہماری زبان میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو اس کے پورے مفہوم کو ادا کر سکے تاہم "ایما و اشارہ" کا لفظ کسی حد تک اس کی قائم مقامی کر سکتا ہے۔ شعر میں جتنی زیادہ ایمائی قوت ہوگی اتنا ہی زیادہ وہ پُر لطف، اہتزاز خیز و اثر انگیز ہوگا۔

شاعر کبھی اپنے خیال کو صریح طور پر بلا کسی واسطے کے ظاہر کر دیتا ہے لیکن یہ طریقۂ اظہار بالکل نثری، بے لطف اور بے اثر ہوتا ہے اِس لئے شاعر کبھی تشبیہ و استعارہ اور کبھی اشارہ و کنایہ کا واسطہ تلاش کرتا ہے اور کبھی خبریہ کو انشا میں منتقل کرتا ہے۔ سب سے زیادہ پُر اثر طریقہ ایما و اشارہ کا ہوتا ہے۔ شاعر ہرگز کسی خیال یا واقعے کی تفصیلات و جزئیات میں الجھنا پسند نہیں کرتا۔ وہ نہ فلسفیوں کی طرح اُن کی تحلیل و تجزیہ کرتا ہے اور نہ منطقیوں کی طرح ہر ٹکڑے کا ثبوت ڈھونڈتا ہے بلکہ وہ صرف اس کے اہم و امتیازی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے اور الفاظ کے انتخاب اور فقروں کی نشست و ترتیب پر خاص توجہ مبذول کرتا ہے تاکہ ہر لفظ اور ہر فقرہ کسی وسیع مضمون کی طرف اشارہ کرے۔ چنانچہ میرزا غالب کے مذکورہ بالا اشعار میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح ایک ایک لفظ "گنجِ معانی کا طلسم" ہے اور ایک وسیع خیال اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔ ماہرینِ فن جس طویل مضمون کو ایک فقرے میں ادا کر دیتے ہیں اُن کے بیان کرنے کے لئے مسلسل گو حضرات کو صفحے کے صفحے درکار ہوں گے۔ لیکن یہ اطناب کلام کا سارا حسن زائل کر دے گا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی خیال کا مسلسل و تفصیلی بیان کیوں کلام کے حسن و اثر کو زائل کر دیتا ہے اور اجمال و اختصار سے شعر کیوں چمک اُٹھتا ہے؟ اِس کی نفسیاتی توجیہ یہ ہے کہ فطرتِ بشری آزادی پسند واقع ہوئی ہے۔ انسان کی حریتِ فکری و آزادیٔ خیال پر جتنی قیود اور پابندیاں عائد کی جائیں گی اُتنی ہی طبیعت بیزاری محسوس کرے گی اور عجب نہیں کہ بغاوت پر آمادہ ہو جائے۔ اگر شاعر کسی خیال یا جذبہ کی مکمل تصویر کشی کے شوق میں اس کے کسی پہلو کی حدود بندی کر دے تو سامع کی قوتِ متخیلہ کو اس حد سے آگے بڑھنے کا موقع نہیں رہے گا اس کی پروازِ تخیل حدودِ معینہ تک پہنچکر رُک جائے گی جس سے وہ ضرور ناگواری محسوس کرے گا۔ اب اگر شاعر تعیینِ حدود ہی پر اکتفا نہ کرکے تفصیلات و جزئیات بھی بیان کرنے لگے تو سننے والے کے لئے صرف دو ہی طریقہ کار ہوں گے۔ یا تو وہ شاعر کے مقرر کردہ حدود کے اندر ہی اپنے دماغ کو محصور کرکے قدم قدم پر شاعر کے بیان کی غلامانہ پیروی و تقلید کرتا جائے یا انتہائی ناگواری محسوس کرکے آمادۂ بغاوت ہو جائے۔ فی الحقیقت اگر شاعر ہی سب کچھ بیان کر دے تو سننے والے کو سوچنے اور غور کرنے کا موقع ہی نہ رہے گا۔ اس لئے اس کی قوتِ فکریہ کی حیثیت محض انفعالی رہ جائے گی اور اس کا فاعلی حصّہ مفلوج ہو جائے گا۔ متخیلہ کو میدانِ عمل یا فضائے پرواز نہ ملنے کے باعث اس کی طبیعت میں بیزاری و افسردگی کا پیدا ہونا یقینی امر ہے۔ اگرچہ ہمارے غزل گو شعرا نے کسی کلیہ میں اصولِ نفسیات کی باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی تاہم وہ اپنے وسیع تجربہ کی بنا پر فطرتِ بشری کے بڑے

نباض تھے، اور لطف انگیزی و اثر آفرینی کے تمام گروں سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کسی خیال یا جذبہ کے صرف ایک پہلو کو دکھانا اور تمام متلازم حالتوں اور کیفیتوں کی طرف صرف اشارہ کر کے سامعین کو اُن کی وسعتِ نظر اور میلانِ طبع کے مطابق لطف اندوز ہونے کا موقع دینا شاعرانہ کامیابی کی کلید ہے۔

آج مغربی نقادانِ فن محاکات کی جس صورت اور اصول پر خاص زور دے رہے ہیں اس پر ہمارے غزل گو شعرا ہمیشہ سے کاربند رہا کئے ہیں۔ مغربی نقادوں کا کہنا ہے کہ کسی خیال کی تصویر اس طرح پیش کی جانی چاہیئے کہ حدود کا تعین نہ ہو، اور اس کا مفہوم محدود ہونے کے بجائے وسعت اختیار کرے، شاعر کو چاہیئے کہ صرف خیال یا جذبہ کے اہم پہلو کو ظاہر کرے اور دوسرے پہلوؤں کی طرف جن کا اظہار مقصود ہے صرف اشارہ کرتا ہوا گذر جائے، وہ بھی اس طرح کہ نہ کوئی پہلو محدود و متعین ہونے پائے اور نہ کسی پہلو کی حد تک سامع کی نظر جائے ابتدا ہی سے اُردو شعرا کے کلام میں یہ خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ ملک الشعرا میر تقی میرؔ کا ایک شعر ہے

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات

کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

شاعر صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ "دنیا کی ہر شے ناپائدار ہے" اگر وہ اس خیال کو بلا کسی واسطے کے سیدھے سادے طریقے پر بیان کر دیتا یا تمام زوال پذیر چیزوں کی فہرست مرتب کر کے ہر ایک کے عروج و زوال کا نقشہ پیش کرتا اور اُن کو ناپائدار ثابت کرتا تو اس تفصیل و ایضاح سے کلام کی ساری دلچسپی اور تاثیر زائل ہو جاتی۔ بلاغت شناس شاعر نے تمام ناپائدار چیزوں میں سے ایک ایسی شے کا انتخاب کر لیا جس کی بے ثباتی ضرب المثل ہے۔ اور فی الحقیقت جن اشیا کی بے ثباتی کا اظہار مقصود ہے اُن کی طرف صرف اشارہ کر دیا۔ چنانچہ "گل" سنتے ہی حسن و جمال جاہ و جلال، قوت و شوکت، ظاہری طمطراق، انسانی زندگی، دنیوی کاروبار اور تمام اُن چیزوں کے نقشے جو تغیرات و انقلابات کے زیرِ اثر ہیں ہماری چشمِ تخیل کے سامنے یکے بعد دیگرے گذرنے لگتے ہیں۔ شاعر نے زوال پذیر اشیا کی تحدید و تعیین بھی نہیں کی ہے تاکہ سامع کا متخیلہ کسی حد پر آکر رک نہ جائے۔ لہٰذا چشمِ تخیل کے سامنے گذرنے والے نقشے ہر شخص کی وسعتِ نظر اور مذاقِ طبیعت کے مطابق ہوں گے۔ شاعر نے بیان کا جو لطیف و دلکش پیرایہ اختیار کیا ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کو پھول دیکھ کر افسوس ہوا کہ وہ کس قدر خوبصورت، خوشنما، باصرہ نواز اور دلفریب ہے لیکن اس کی پائداری کتنی ہے؟ زیادہ سے زیادہ صرف ایک دن یا دو دن۔ اس پر کلی مسکرائی اور بولی کہ نہیں جناب آپ کا اندازہ غلط ہے، گل کا ثبات اس قدر بھی

نہیں جتنا آپ نے سمجھ رکھا ہے۔ وہ تو برقِ خندہ کی طرح صرف ایک لحظہ کا مہمان ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ پھول کھلتے ہی مدارج فناطے کرنے لگتا ہے۔ اس کی ہستی بجلی کی کوندا اور چنگاری کی چمک کی طرح آن کی آن میں نابود ہوجانے والی ہے۔ رموزِ بلاغت کے ماہر شاعر نے "دو روزہ" یا "چند روزہ" کا لفظ کہکر مدتِ ثبات کا بھی تعین نہیں کیا ہے۔ بلکہ ایک کثیر المعنی جملہ "کلی نے یہ سن کر تبسم کیا" استعمال کرکے سننے والوں کی قوتِ متخیلہ کے لئے لامتناہی میدانِ عمل یا وسعتِ پرواز پیدا کردیا ہے۔ ہر شخص آزاد ہے کہ وہ اپنی سمجھ، ادراک، میلان اور مذاق کے مطابق "تبسمِ غنچہ" کے مفہوم اور موقع پر غور کرے اور مدتِ ثبات کا اندازہ لگائے۔ غرض کہ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو مغربی نقادانِ فن کے نزدیک اعلیٰ شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں مسلسل گوئی ان تمام خوبیوں کو خاک میں ملادے گی۔

تفصیلات وجزئیات کی بے اثری ۔ اوپر بیان ہوچکا ہے کہ تفصیلات وجزئیات کا استقصا کلام کو بے لطف وبے اثر بنادیتا ہے۔ لیکن اِس کے علاوہ اور اسباب بھی ہیں جن کی بنا پر تفصیلات وجزئیات سے احتراز کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ شاعری میں زیادہ تر عامۃ الورود واقعات بیان ہونے چاہئیں۔ اگر شاعر اپنے کلام میں محض شخصی انفرادی وموقتی جذبہ کی تصویر کھینچے تو دوسرے لوگ اس سے کما حقہٗ حظ اندوز یا متاثر نہ ہوں گے اور ایسا کلام ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اکابر شعرا بالعموم ایسے خیالات وجذبات کی ترجمانی کرتے ہیں جو ہر ملک، ہر زمانہ اور ہر شخص کی حالت پر صادق آئیں۔ انسان جب کسی شعر کو اپنی طبیعت اور ذہنی کیفیت کے مطابق پاتا ہے تو اس سے بیحد متاثر ومحظوظ ہوتا ہے چنانچہ مرزا غالب نے اسی صداقت کو اس شعر میں ظاہر کیا ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

لیکن یہ بھی ایک نفسیاتی واقعہ ہے کہ دو آدمیوں کے خیالات وافکار میں کلّی اتحاد مشکل ہے اور تفصیلات وجزئیات میں تو اختلاف کا پایا جانا لازمی ویقینی امر ہے۔ اِس لئے اگر شاعر اپنے کلام میں کسی خیال یا جذبہ کو صراحت ووضاحت کے ساتھ بیان کرے گا تو اس کی نوعیت وماہیت لامحالہ شخصی وانفرادی ہوجائے گی۔ ایسے اشعار سے بوجہ اختلافِ حالات سامع زیادہ لطف اندوز وتشکیف نہیں ہوسکتا اِس لئے شاعر کو چاہیئے کہ تفصیلات وجزئیات میں نہ الجھے اور نہ مسلسل گوئی کی خاطر محاسن شعری کا خون کرے بلکہ جہاں تک ممکن ہو ایک ہی شعر میں کسی خیال یا جذبہ

کے صرف اہم و ضروری پہلو کو نمایاں کر دے۔

اور بھی کئی مواقع ہیں جہاں تفصیلات و جزئیات سے احتراز لازم ہے۔ چنانچہ صاحبِ "شعر العجم" کا بیان ہے کہ "بعض جگہ محاکات کے موثر ہونے کے لئے یہ ضرور ہے کہ تصویر ایسی دھندلی کھینچی جائے کہ اکثر حصے اچھی طرح نظر نہ آئیں۔ عالم ارواح یا ملائکہ کی جو فرضی تصویر کھینچی جاتی ہے اس میں صورتوں کو اور لباس کو نمایاں نہیں کرتے کیونکہ انسان پر کسی شے کا اثر اُس وقت زیادہ پڑتا ہے جب وہ اچھی طرح نظر نہ آئے۔ ذخار سمندر کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں کہ موجیں اور آسمانی فضا دھندلی نظر آئے۔ اندھیری راتوں میں دور سے جنگل میں کوئی دھندلا سا عکس نظر آتا ہے تو انسان ہیبت زدہ ہو جاتا ہے کہ معلوم نہیں کس درجہ مہیب چیز ہے۔ اسی طرح بعض اوقات جب کسی چیز کی عظمت کی تصویر کھینچنی مقصود ہوتی ہے تو تصویر کے کل حصے نمایاں نہیں کئے جاتے اور واقعے کی تمام اجزا کا ذکر نہیں ہوتا۔ برک نے لکھا ہے کہ ملٹن کی "پیراڈائیز لاسٹ" (فردوس گم شدہ) میں سب سے زیادہ شاعری اس موقع پر صرف کی گئی ہے جہاں شیطان کی تعریف ہے اور وہاں اسی طریقہ سے کام لیا گیا ہے"۔ غرض کہ ایسے موقعوں پر محاسن شعری اختصار و اجمال کے متقاضی ہیں نہ کہ تفصیل و ایضاح کے۔

پنڈت برج نرائن چکبست کا ایک شعر ہے۔

دردِ دل، پاسِ وفا، جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

شاعر نے کس عمدگی سے صرف تین اوصاف یعنی دردِ دل، پاسِ وفا اور جذبۂ ایماں کو سنگِ بنیاد قرار دے کر ان پر انسانیت کی عالیشان عمارت کھڑی کر دی ہے۔ ہر قوم، ہر جماعت، ہر فرقے کے نزدیک یہ سہ گانہ اوصاف تمام مکارم اخلاق کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کوئی شخص شاعر کے بیان کی تردید نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر وہ تفصیل و ایضاح سے کام لیتا اور ان تمام فضائل اخلاق کی توضیح و تشریح کرتا جو اس کے خیال میں آدمیت و انسانیت کے لوازم ہیں تو یہ اس کا شخصی مجموعۂ اخلاق ہوتا جس سے ہر شخص کا متفق ہونا ممکن نہیں۔ اس لئے وہ ایک نزاعی مسئلہ بن جاتا۔ واضح رہے کہ ہر ملک، ہر زمانہ اور ہر معاشرہ کا مجموعۂ اخلاق جُدا گانہ ہوتا ہے۔ ایک جماعت کسی بات کو داخلِ اخلاق سمجھتی ہے لیکن دوسری جماعت کے نزدیک وہی بات بداخلاقی میں شمار ہوتی ہے۔ یورپ کا اخلاق نمائشِ حسن کا حامی ہے لیکن ایشیا اسے بے حجاب کرنا نہیں چاہتا۔ مشرق میں بہترین عورت وہ ہے جو خانہ داری کا اعلیٰ سلیقہ رکھتی ہو اور شوہر کی بہترین مونس و غمگسار ہو۔ مغرب میں بہترین عورت کا تخیل یہ ہے کہ اس کے باکمال رقص کے

کہ ایک خلقت اِس پر جان دے رہی ہے ۔ مومن کے خیال میں اِس قتلِ عام کا اصلی سبب معشوق کا ناز و انداز نہیں بلکہ عاشق کی چشمِ خونبار ہے ۔ اِس شعر میں یہ جملے محذوف ہیں کہ معشوق کے دامن اُٹھا کر آنے میں ایک ایسی ادا پیدا ہو گئی ہے جس پر ایک عالم جان دے رہا ہے" لیکن سننے والے کو یہ محذوفات بہ آسانی سمجھ میں آجاتے ہیں بہرحال یہ تمام شاعرانہ خوبیاں اختصار و اجمال کا نتیجہ ہیں۔ یہ خوبیاں غزل کے اشعار میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں مسلسل گوئی و طولِ بیانی ان اوصاف سے بالعموم معرا ہوتی ہے ۔

غزل گوئی کا پردۂ تصویر ۔ معترضین کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو غزل گو شاعروں کو کمتر درجہ کا مصور خیال کرتا ہے ۔ ان کی سطح آشنا نظروں میں غزل کی تصویر کا پردہ نہایت تنگ و محدود معلوم ہوتا ہے ۔ چنانچہ ہندوستان کی ایک مشہور جامعہ کے ایک یورپ زدہ پروفیسر صاحب نے جہاں ڈیڑھ جز کا رسالہ لکھ کر خدائے سخن غالب کی کہیں منزلت عظمت کو گھٹانے کی سعی نامشکور فرمائی ہے وہاں انہوں نے تمام غزل گو شعرا کے کمالِ فن کاری پر بھی چند حرف گیریاں کی ہیں ۔ چنانچہ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ "غزل گو شاعروں کی جولانگاہ صرف ایک شعر یا فرد یا بیت ہوتی ہے ۔ محض ایک ذہنی چمک ، ایک ہوتی سوجھ اور چند الفاظ کی بندش پر اُن کی ساری فن کاریوں اور صناعیوں کا انحصار ہے ۔ لیکن مثنوی ، قصیدہ ، مسدس ، ترکیب بند اور مرثیہ وغیرہ کی صنعتگری کا یہ حال نہیں ہے ۔ یہاں رنگ کاری و مصوری کا پردہ نہایت کشادہ ، اور خیال و جذبہ بہت دیرپا ہوتا ہے ۔ ان کے مقابلے میں غزل کی فن کاری کوئی حقیقت نہیں رکھتی" ۔ یہ بیان صحت و صداقت سے دست و گریباں نہیں ہے ۔ اوّل تو ایسے شاعر ہی بہت کم گذرے ہیں جنہوں نے صرف غزل ہی پر طبع آزمائی کی ہو اور دوسرے میدانوں میں اپنے شبدیزِ قلم کی جولانی نہ دکھائی ہو ۔ اساتذۂ سخن کے دواوین جملہ اصنافِ سخن پر محتوی ہیں ۔ ان میں غزل ، قصیدہ ، مثنوی ، قطعہ ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، رباعی ، فرد سب کچھ پائے جاتے ہیں ۔ انہوں نے چھوٹے بڑے ہر قسم کے پردے پر اپنی مصوری کا کمال دکھایا ہے ۔ ان کا کلام اعلیٰ درجے کی حسن کاری کا نمونہ ہے اور ان کی نقاشی و مصوری انسان کو محوِ حیرت بنا دیتی ہے

لیکن اگر کوئی شاعر صرف میدانِ غزل ہی میں شہسواری کے جوہر دکھائے تو بھی اس کے فنی کمال پر حرف گیری نہیں کی جاسکتی ۔ مصوری و نقاشی کے لحاظ سے بھی اس کا پایہ بلندی میں کسی سے کم نہیں ۔ اگر غزل کا پردۂ تصویر بہت بڑا نہ بھی ہو تو کیا ہرج ہے ۔ مصوری کی خوبیوں کا انحصار پردہ کی کشادگی اور وسعت پر نہیں بلکہ تصویر کی خوشنمائی ، نزاکت ، باریکی اور نفاست پر ہے ۔ تاریخ ادبیاتِ اُردو کا ایک دور ایسا بھی گذرا ہے جبکہ لکھنؤ میں نہایت سیر حاصل غزلیں لکھنے کا رواج ہو گیا تھا ۔ شعرا بسا اوقات دوغزلہ سہ غزلہ ، چوغزلہ لکھ لکھ کر اپنے کمالِ فن کا اظہار

کرتے تھے۔ لیکن یہ طریقہ مستحسن نہ تھا کیونکہ غزل میں اطناب وطوالت بیزاری پیدا کرتی ہے۔ علاوہ بریں سیر حاصل غزل کے لئے تمام قافیے باندھنے پڑتے تھے جس سے بعض مبتذل اور بکٹس بھُسے اشعار معرضِ وجود میں آتے تھے۔ تاہم اگر پردوں کی محض قد وقامت کوئی وزن واہمیت رکھتی ہو تو ان سیر حاصل غزلوں کے پردے کو کون شخص تنگ ومحدود قرار دے سکتا ہے۔ لیکن حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ پردے کی کشادگی فنی نقطۂ نظر سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ بڑے گھڑیال کے مقابلہ میں چھوٹی گھڑی کے کل پرزے زیادہ باریک ونفیس ہوتے ہیں۔ اسی طرح چھوٹی نظموں میں بڑی نظموں سے زیادہ شاعرانہ خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

غزل اور دوسرے اصنافِ سخن کے پردوں میں اگر کچھ فرق ہے تو وہ قد وقامت یا ڈیل ڈول کا نہیں بلکہ نوعیت وکیفیت کا ہے۔ اگر مثنوی یا قصیدہ کے کشادہ پردے پر طویل القامت برگد سایہ فگن ہے تو غزل کی خوشنما پردہ پر گل ولالہ کی نظر فریبیاں طراوت بخش ہیں۔ اگر ایک دریائے مواج یا صحرائے لق ودق کا منظر پیش کرتا ہے تو دوسرا حوض وگلزار اور سبزہ وجوئبار کا نظارہ دکھاتا ہے۔ اگر ایک میں الاؤ روشن ہے تو دوسرے میں سروچراغاں کی بہار نظر آتی ہے۔ اگر ایک میں سیمرغ دراز قد محوِ پرواز ہے تو دوسرے میں عنادلِ خوش منقار مصروفِ نوا پیرائی ہیں۔ اگر ایک میں بھاری بھرکم جہاز سمندر کا سینہ چیرتا ہوا نظر آتا ہے تو دوسرے میں سطحِ آب پر نور کی کشتیاں تیرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اگر مسلسل گو شاعر پہاڑ کاٹ کر ابوالہول یا گوماتا کا دیوہیکل مجسمہ تیار کرتا ہے تو غزل گو شاعر سنگِ رخام کے خوبصورت زندہ نما مرمریں بُت تراش کر اپنے کمالِ آذری کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔ کیا انصاف اسی کا مقتضی ہے کہ اگر شاعر کسی لمبے چوڑے پردے پر چھتنار پیپل کی تصویر کھینچ دے تو اس کی فن کاری کی تعریف کی جائے لیکن جب وہ اپنے خونِ جگر سے اُس پر لالہ کاریاں کرے تو قدر شناسی آنکھیں بند کرے! مسلسل گو اور غزل گو دونوں بحرِ معنی کے غواص ہیں لیکن ایک ہمارے سامنے مونگے کا چٹان رکھ دیتا ہے اور دوسرا آبدار موتی کشتی میں سجا کر پیش کرتا ہے۔ کیا ان موتیوں کی صرف اس لئے ناقدری کرنی چاہیئے کہ وہ ناسفتہ کیوں ہیں؟ دنیا میں بہت سی چھوٹی چیزیں ایسی ہیں جن کی قدر وقیمت کو بڑی چیزیں نہیں پاسکتیں چنانچہ شیرازی حکیم کا قول "ہرچہ بقامت کہتر بقیمت بہتر" حق وصداقت پر مبنی ہے۔

اوپر بیان ہوچکا ہے کہ اساتذہ کا ہر شعر بالعموم کسی طویل واقعے یا وسیع خیال وجذبہ کی مختصر روداد ہوتا ہے اسی مضمون کو شاعر چاہے تو تفصیل کے ساتھ تیس چالیس سطروں میں پھیلا کر بیان کرسکتا ہے۔ ایسی صورت میں تقطیع وجسامت کا اختلاف کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ محض پیمانے کی چھوٹائی بڑائی نقاش کی فنی مہارت پر اثر انداز نہیں

ہو سکتی۔ طویل مسلسل نظم کی مثال بڑے پیمانے پر کھینچے ہوئے نقشے سے دی جاسکتی ہے جو دیوار پر آویزاں کیا جاتا ہے اور غزل کا شعر چھوٹے پیمانے پر کھینچے ہوئے نقشوں کے مانند ہے جو اٹلس کا جزو ہوتا ہے۔ الغرض غزل گوئی کا پردۂ تصویر چھوٹا ہونے کے باوجود بھی بڑے پردوں سے کم خوشنما نہیں ہوتا بلکہ نزاکت و نفاست کے لحاظ سے وہی بہتر ہوتا ہے۔

اہلِ مغرب کی نگاہ میں مختصر گوئی کی اہمیت۔ مذکورۂ بالا بحث و تمحیص نے ہمیں اس نتیجہ پر پہنچا دیا ہے کہ غزل کا ہر شعر ایک مستقل مضمون ادا کرتا ہے۔ لہٰذا ہر شعر ایک مکمل نظم کے پہلو بہ پہلو رکھا جا سکتا ہے۔ جس طرح مختلف نظموں میں جُداگانہ خیالات یا واقعات بیان کیے جاتے ہیں اسی طرح غزل کے متفرق اشعار معنی و مفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے متغائر ہوتے ہیں۔ اگر دو آزاد نظموں میں ایک ہی قسم کے خیال کا ادا ہونا ضروری نہیں ہے تو دو اشعار میں بھی تسلسلِ خیال کی تلاش فضول ہے۔ جس طرح چار مصرعوں کی رباعی ایک مکمل و آزاد نظم ہے اسی طرح دو مصرعوں کا ایک شعر بھی ایک مستقل نظم ہے۔

بہ لحاظِ جسامت نظم کی دو قسمیں قرار دی جاسکتی ہیں۔ چھوٹی نظمیں جن میں ایک سطری شعر، فرد، بیت یا غزل کا منفرد شعر، تین مصرعوں کی نظم یعنی ثلاثی، چار مصرعوں کی نظم یعنی رباعی شامل ہیں۔ اُردو میں ایک سطری نظم اور ثلاثی کا رواج نہیں ہے البتہ فرد اور رباعی سے ہر شخص واقف ہے۔ طویل نظموں میں قصیدہ، مثنوی، مسدس، ترکیب بند اور انگریزی طرز کی نظمیں شامل ہیں۔ اگر غزل کے ہر شعر کو ایک آزاد چھوٹی نظم سمجھ لیا جائے تو پھر اس کے لیے نہ مسلسل گوئی کی ضرورت باقی رہتی ہے اور نہ اس پر ریزہ خیالی کا الزام درست ہو سکتا ہے۔

اب بحث طلب امر یہ ہے کہ چھوٹی اور طویل نظموں میں کون زیادہ اہم، ادق اور موثر ہے۔ انگریزی شاعری میں مختصر گوئی کا عنصر تقریبًا مفقود ہے اس لیے جن لوگوں کا دماغ انگریزی وضع سے خواہ وہ مدنی ہو یا معاشرہی، علمی ہو یا فنی مرعوب ہو وہ غزل کے پردۂ تصویر کو تنگ و محدود قرار دے کر غزل گو شعرا کا شمار ادنیٰ درجے کے مصوروں میں کرتے ہیں لیکن ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ خود مغربی نقادانِ فن کے نزدیک مختصر گوئی کی کیا قیمت و اہمیت ہے۔ بہت سے نقادوں کے خیالات و آراء کا استقصا موجبِ طوالت ہوگا لہٰذا ہم صرف دو نہایت مشہور و معروف ادیبوں کی رائے درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ چونکہ مغرب کا اطلاق یورپ اور امریکہ دونوں پر ہوتا ہے اس لیے ہم دونوں بر اعظموں سے ایک ایک نقاد کا انتخاب کرنا مناسب خیال کرتے ہیں۔

امریکہ کے مشہور و معروف ادیب اڈگر آلن پو کے نام سے ہر انگریزی مدرسہ کا متعلم واقف ہوگا۔ یہ زبردست

نقاد اپنے مقالہ" شاعرانہ اصول" میں رقمطراز ہے کہ اصل شاعری مختصر نظموں ہی میں پوشیدہ ہوتی ہے ۔طویل نظموں میں بحیثیتِ مجموعی شعریت کا فقدان ہے ۔بلکہ فنی نقطۂ نظر سے "طویل شاعری" ایک مہمل و بے معنی فقرہ ہے۔ " شاعری" اور " طوالت" ایک دوسرے کی ضد ہیں جن کا اجتماع ممکن نہیں ۔شعر وہ ہے جو قلب میں اہتزاز اور روح میں مملویت پیدا کرے ۔کسی نظم کی قدر وقیمت اس کی نشاط خیزی و اہتزاز آفرینی پر موقوف ہے نہ کہ اس کی طوالت وجسامت پر۔ طویل نظمیں بجائے لطف انگیز و فرحت بخش ہونے کے بسااوقات بیزاری اور تکان پیدا کرتی ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی واقعہ ہے کہ اہتزاز و نشاط اور ہیجان و تلاطم کا اثر عارضی و ہنگامی ہوتا ہے ۔ کسی لمبی چوڑی نظم کے پورے دورانِ مطالعہ میں شروع سے اخیر تک جوش واثر کا یکساں طور پر قائم رہنا محال ہے زیادہ سے زیادہ نصف ساعت تک جوش وخروش قائم رہ سکتا ہے اس کے بعد بیزاری کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے ۔

بعض لوگ جو اپنی آزادانہ تنقیدی نظر نہیں رکھتے وہ تاریخ ادبیات کے اکابر رجال سے مرعوب ہوکر بغیر کسی ذاتی تجربے کے کہہ دیتے ہیں کہ ہومر کی "ایلیڈ" ملٹن کا "فردوس گم شدہ" یا فردوسی کا "شاہنامہ" ابتدا سے انتہا تک جذباتِ انسانی میں یکساں طور پر تلاطم و ہیجان پیدا کرنے کا مادہ اپنے اندر رکھتا ہے ۔ان کتابوں کی ضخامت وطوالت کی وجہ سے پڑھنے والے کے دل میں کوئی ناگوار احساس رونما نہیں ہوتا۔لیکن اس قول کو صداقت سے اتنا ہی بعد ہے جتنا نور کو ظلمت سے ، علم کو جہل سے اور نیکی کو بدی سے ۔ تنقید نگاری کی یہ عام غلطی ہے کہ انسان تاریخی اعاظم رجال کے کارناموں سے مرعوب ہوکر نہیں تمام ادبی خوبیوں کا منبع سمجھ لگتا ہے اور اپنی قوتِ تمیزی کو خیرباد کہکر ان کے پست سے پست کلام کی بھی تعریف و توصیف میں رطب اللساں نظر آتا ہے ۔ میتھیو آرنلڈ نے اس غلط طریقۂ تنقید کا اصطلاحی نام" مغالطۂ احترامِ تاریخی" Fallacy of Historic Estimate قرار دیا ہے ۔بہرحال مذکورہ بالا عظیم الشان رزمی کارنامے اسی وقت شاعرانہ کہلا سکتے ہیں جب کہ ان سے " وحدت" Unity کی صفت دور کردی جائے ۔ جو ارسطو کے مطابق تمام فنونِ لطیفہ کی بہترین پیداوار کے لیئے لازمی شرط ہے ۔" وحدت" کی قید سے رہائی پاکر یہ رزمیات چھوٹی چھوٹی نظموں کا سلسلہ قرار پائیں گی ۔ لیکن اگر ہم ان کی " وحدت " کو برقرار رکھکر ان کے اجتماعی نقوش تاثر پر غور کرنے کے لیئے ان کا مطالعہ کرنے لگیں تو ایک ہی نشست میں ہمیں معلوم ہوجائے گا کہ بعض بعض اشعار صد درجہ کے جوش آفریں ہیں لیکن درمیانی عبارتیں بالکل روکھی پھیکی ہیں جنہیں شعر کہنا گویا

شاعری کو کند چھری سے ذبح کرنا ہے۔ علاوہ بریں ان ضخیم رزمی کتابوں کو ایک بار ختم کرنے کے بعد اگر ہم ان کا دوبارہ مطالعہ کریں تو ہمیں یہ معلوم کر کے سخت تعجب ہوگا کہ بعض اشعار جو پہلے تحیر خیز تھے اب ادنےٰ و پست نظر آرہے ہیں۔ اس کے برعکس بعض سطریں جو پہلے بالکل بے اثر تھیں اب ولولہ خیز بن گئی ہیں۔ یہ تمام امور ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں کہ دنیا کے بہترین رزمی کارنامے بھی بحیثیت کل کوئی مستقل اثر و ارتسام پیدا نہیں کرتے البتہ جزئی لحاظ سے ان کی بعض سطروں میں اعلیٰ درجہ کی شعریت پائی جاتی ہے۔ یہی سطریں صحیح معنوں میں شعر ہیں بقیہ خشک و بے اثر سطور کو محض منظوم واقعات سمجھنا چاہیئے۔

اوپر جو کچھ بیان ہؤا وہ خلاصہ ہے اڈگرالن پو کے خیالات کا۔ ان سے صاف ظاہر ہے کہ صرف مختصر نظمیں ہی شاعرانہ خوبیوں کی حامل ہوتی ہیں مسلسل و طویل نظموں میں کہیں کہیں ایسی ایک دو سطریں مل جاتی ہیں جن کو حقیقی معنوں میں شعر کہہ سکتے ہیں۔ غزل کا ہر شعر چونکہ ایک مکمل مضمون کا حامل ہوتا ہے اس لیئے وہ بذاتِ خود ایک آزاد مختصر نظم ہے شعر کی اصل خوبی اس کی نشاط خیزی و اثر آفرینی پر موقوف ہے کون نہیں جانتا کہ غزل کے اکثر و بیشتر اشعار میں صدرجہ کی گرمی، تڑپ، سوز و گداز اور اثر پایا جاتا ہے۔ اس لیئے اڈگرالن پو کے معیار پر غزل کا شعر پورا اترتا ہے۔ طویل مسلسل نظموں کی شاعرانہ خوبیاں بھی ان کے منفردہ اشعار ہی کی اہتزاز آفرینیوں اور جوش انگیزیوں کی رہینِ منّت ہیں۔

اڈگرالن پو اسی مضمون یعنی "شاعرانہ اصول" میں مختصر گوئی کے خطرات کا بھی ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ اگرچہ بلاغت اختصار کی متقاضی ہے لیکن کلام اتنا مختصر بھی نہیں ہونا چاہیئے کہ مفہوم تشنہ رہ جائے۔ اگر مطلب فوراً سمجھ میں نہ آسکے تو یہ شاعری کا بہت بڑا نقص متصور ہوگا۔ ہمارے بلاغت شناس غزل گو شعرا اس رمز سے بیخبر نہ تھے چنانچہ ہمارے شاعروں نے اس عیب کا نام "تعقید" رکھا ہے جو معنوی بھی ہوسکتی ہے اور لفظی بھی۔ شعر کی بڑی خوبی یہی قرار دی گئی ہے کہ پڑھنے کے ساتھ ہی اس کا مفہوم سامع کے ذہن میں متبادر ہو جائے۔ اگر پورا مطلب ادا کرنے کے لیئے شعر میں کافی الفاظ نہ ہوں تو اس پر اَلْمَعْنیٰ فِیْ بَطْنِ الشَّاعِر کا الزام عائد ہوتا ہے۔ اوپر بیان ہوچکا ہے کہ بعض وقت کوئی باکمال شاعر کسی خیال کے صرف اہم و امتیازی خصوصیات کا ذکر نہایت دلپذیر انداز سے کر دیتا ہے لیکن درمیانی کڑیوں کو دریافت کرنا اور ان کو باہم ملانا سامع کا کام ہے۔ اگر سننے والے کا ذہن فوراً خلا کو پُر کرے تو شعر چمک اٹھتا ہے لیکن اگر محذوفات اس قدر زیادہ ہوں کہ سامع کا ذہن ان کو پانے سے قاصر رہے تو شعر شعر باقی نہیں رہتا بلکہ معما یا چیستان بن جاتا ہے جس کی ہمیشہ مذمت کی گئی ہے۔ چنانچہ عرصہ دراز سے

اس کی ایک مثال ضرب المثل بن کر رائج چلی آرہی ہے اور شعرا اس قسم کے معمے سے پرہیز کرتے رہے ہیں۔ معمایہ ہے

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

مطلب یہ ہے کہ شہد کی مکھی باغ میں جائے گی تو چھتّے بنائے گی جس سے موم پیدا ہوگا۔ موم سے موم بتی بنے گی۔ جب شمع روشن ہوگی تو پروانے آکر جان نثار کرنے لگیں گے۔ بیچارے پروانوں کو بچانے کی سب سے اچھی تدبیر یہی ہے کہ مگس کو باغ میں جانے ہی نہ دیا جائے۔ یہاں اتنی کڑیاں چھوڑ دی گئی ہیں کہ سامع کا ذہن اُن کی مدد سے قاصر رہتا ہے۔ چونکہ اڈگرالن پو نے جس خطرہ کا ذکر کیا ہے اُس سے غزل گو شعرا ابتدا ہی سے آگاہ تھے لہذا ہر زمانہ میں اس خطرہ سے بچنے کی کوشش جاری رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ غزل کا ہر شعر باوجود انتہائی ایجاز و اختصار کے اعلیٰ درجہ کی شاعرانہ خوبیوں سے مملو ہوتا ہے۔ سچی شاعری کے لئے مسلسل گوئی کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔

دوسرا مغربی نقاد جس کی رائے مختصر گوئی کے متعلق پیش کرنی ہے وہ انگلستان کا ایک نامور ادیب لفکا ڈیو ہرن ہے۔ جامعۂ ٹوکیو جاپان میں مدت تک انگریزی ادبیات کا پروفیسر رہنے کی وجہ سے اس کو انگریزی اور جاپانی شاعری کے مقابلہ و موازنہ کا کافی موقع ملا تھا۔ لفکا ڈیو ہرن کا بیان ہے کہ مغرب کے مقابلہ میں مشرق نے مختصر گوئی میں کہیں زیادہ ناموری حاصل کی ہے۔ مشرقی شعرا اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات اور لطیف سے لطیف جذبات کو صرف ایک دو سطروں میں ایسے دلپذیر انداز سے بیان کر دیتے ہیں کہ وہ مغربی دنیا کے لئے معجزہ سے کم نہیں ہوتے۔ تاہم یورپی شاعری بحیثیت مجموعی مختصر نظموں سے بالکل بے بہرہ نہیں ہے۔ یونان بھی یورپ ہی کا خطہ ہے۔ قدیم یونانی جن کے یہاں شاعری اور دوسرے فنونِ لطیفہ معراجِ کمال کو پہنچ گئے تھے چھوٹی نظموں کے دلدادہ تھے۔ یونانی زبان کا عشقیہ کلام زیادہ تر بیتوں اور ثلاثیوں یعنی دو اور تین مصرعوں کے اشعار پر مشتمل ہے۔ بعض شعر صرف ایک سطر یا ایک مصرعہ کے بھی ہوتے تھے۔ سائمنڈ نے اکثر قدیم یونانی اشعار کا انگریزی ترجمہ کیا ہے۔ چنانچہ اس کی کتاب "یونانی شاعری کا مطالعہ" ابیات ثلاثیات اور رباعیات سے لبریز ہے ان میں بہت سی بیتیں اختصارِ مضمون، لطافتِ خیال، جوش و خروش، درد و محبت اور سوز و گداز کے لحاظ سے غزل کے اشعار کا آئینہ معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یونانی عشقیہ شعر کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے:۔

"اے میرے فلکِ محبت کے ماہِ تاباں اگر یہ لاتعداد ستارے میری آنکھ بن جاتے تو میں تمام چشمہائے انجم سے تجھی کو دیکھا کرتا"

یونانیوں کے نقشِ قدم پر چل کر رومیوں نے بھی مختصر گوئی کو رواج دیا لیکن ان کی تمام چھوٹی نظمیں محض طنزیہ یا ہجویہ ہیں۔ بدقسمتی سے قدیم شعرائے انگلستان نے رومیوں کی ہُو بہو تقلید کی اور لاطینی زبان میں ہجوگوئی شروع کر دی۔ کیونکہ اس وقت تک انگریزی زبان صرف بول چال کے لئے مستعمل تھی۔ اس میں ابھی علمی وادبی زبان بننے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی تھی۔ بہرحال ہجوگوئی کی کثرت نے مختصر نظموں کا جمالیاتی عنصر برباد کر دیا۔ چنانچہ بن جانسن نے بہت سی بیتیں ثلاثیاں اور رباعیاں لکھی ہیں جو تمام طنزیہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ہیرک نے بھی بن جانسن کی طرح ابیات، ثلاثیات اور رباعیات میں نام پیدا کیا لیکن اس کے کلام میں بھی ہجو اور استہزا کا عنصر غالب ہے۔ عہدِ الزبتھ میں بھی بعض جلیل القدر شعرا لاطینی شعرا کے نقشِ قدم پر چلتے رہے اور چھوٹی چھوٹی ہجویہ نظمیں معرضِ وجود میں آتی رہیں۔ الغرض بدمذاقی روز بروز ترقی کرتی گئی یہاں تک کہ اٹھارھویں صدی میں ہجونگاری و بدگوئی اور تضحیک واستہزا کا طوفان برپا ہوگیا۔

البتہ موجودہ دور میں جب مغربی دنیا حافظ کی غزلوں اور عمر خیام کی رباعیوں سے روشناس ہوئی تو اُسے معلوم ہؤا کہ ابیات ورباعیات میں ہجو اور تمسخر کے علاوہ لطیف خیالات، پاکیزہ جذبات اور حکیمانہ نکات بھی ادا کئے جا سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ اہلِ مغرب کو اس کا بھی احساس ہؤا کہ تمام اصنافِ سخن میں غزل اور رباعی ہی سب سے زیادہ ادق اور مشکل ہیں۔ فقط دو یا چار مصرعوں میں نہایت موثر طریق پر کسی وسیع خیال کو ادا کرنا ایسا دشوار کام ہے کہ صرف اہلِ کمال ہی اس سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ البتہ جرمانیہ کے سب سے بڑے شاعر گوئٹے نے مختصر گوئی کے کمان کو زہ کیا۔ اس کی مختصر نظمیں مشرقی شعرا کے کلام کے پہلو بہ پہلو رکھی جا سکتی ہیں کیونکہ ان میں مشرقی روحانیت کا عنصر بڑی حد تک پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی ایک رباعی کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے۔

"جو شخص کبھی لذتِ درد سے آشنا نہیں ہوا اور جس کا بستر گریۂ نیم شبی سے تر نہیں ہؤا
وہ حقائق ومعارف سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا"

افسوس ہے کہ غزل کے اشعار اور رباعیوں کی خوبیوں سے آگاہ ہونے پر بھی انگلستان کے کسی شاعر نے انگریزی زبان میں بیتیں اور رباعیاں نہیں لکھیں۔ ایک فٹز جیرلڈ نے البتہ عمر خیام کی رباعیوں کا بہترین ترجمہ کیا ہے۔ اور نقل میں اصل کی شان پیدا کر دی ہے۔ انگریزی زبان میں بیتوں، ثلاثیوں اور رباعیوں کی سخت کمی کے باوجود انگلستان اس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ اس کے فرزندوں نے اگر مادری زبان میں نہیں تو کم سے کم لاطینی زبان میں مختصر نظموں پر کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے۔ اہلِ انگلستان اگرچہ اسی کمان کو زہ نہ کر سکے

لیکن وہ اس کی قدرومنزلت ضرور کرتے تھے اور بیت ورباعی کے گرویدہ تھے۔ چنانچہ لفکاڈیو ہرن کا بیان ہے کہ ایک بار انگلستان کی جاماتی مجلس کی جانب سے تمام شعرا کو ایک انعامی مقابلہ کی دعوت دی گئی۔ طبع آزمائی کے لئے جو مضمون مقرر کیا گیا تھا وہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کا ایک محیر العقول معجزہ تھا جس نے آبِ زلال کو ارغوانی شراب بنا دیا تھا۔ تمام نامی گرامی شعرا نے بڑی بڑی نظمیں لکھکر اس مقابلہ میں شرکت کی تھی۔ لیکن ایک متعلم نے سارے معجزہ کی کیفیت صرف ایک شعر میں ادا کر دی جو تغزل کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس شعر کا ترجمہ یہ ہے۔

آقائے نامدار کی جوں ہی نظر پڑی
شرما کے تمتما گیا روئے نگارِ آب

جوہریانِ سخن شعر کی گرمی و تاثیر، بیان کی رنگینی و ندرت اور تشبیہ کی جدت و لطافت سے پھڑک اٹھے اور طول طویل نظموں پر اِس شعر کو ترجیح دی اور متعلم کو اوّل درجہ کے انعام سے سرفراز کیا۔ اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ اگرچہ انگریزی شاعری کا دامن صنفِ غزل کے جواہر پاروں سے خالی ہے تاہم بلاغت شناس ماہرین فنِ شعر کی خوبیوں کے قدردان ضرور ہیں۔

یونانی ولاطینی نمونے پر جن انگریزیا امریکی شعرا نے انگریزی زبان میں مختصر نظمیں لکھنے کی کوشش کی ہے اُن میں بن جانسن اور ہیرک کے علاوہ والٹر لینڈر۔ ولیم واٹسن اور ایمرسن بھی شامل ہیں لیکن کسی کو پوری کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس ناکامیابی کی وجہ خود لفکاڈیو ہرن کی زبانی ملاحظہ ہو۔ وہ کہتا ہے کہ ابیات، ثلاثیات اور رباعیات میں انگریزی شاعری کی کم مائگی کا سبب یہ نہیں ہے کہ انگریزی شعرا مختصر گوئی کی قدر نہیں جانتے کیونکہ انہوں نے یونانی ولاطینی زبانوں میں عمدہ سے عمدہ مختصر نظمیں لکھی ہیں، وہ بیتوں اور رباعیوں کے جوہر شناس ضرور ہیں لیکن ان کو مجبوری یہ ہے کہ ابھی انگریزی زبان یونانی اور لاطینی زبانوں کی بلند سطح تک نہیں پہنچی ہے ابھی وہ ارتقا کے مدارج طے کر رہی ہے۔ اِس میں ابھی وہ لوچ، ترنم، حلاوت، نرمی، شستگی، صفائی اور روانی نہیں پیدا ہوئی ہے جس کی مختصر گوئی کو سخت ضرورت ہے۔ یورپ کی دوسری زبانیں بھی انگریزی ہی کی طرح ابھی عبوری حالت میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی شعرا کے لئے معانیٔ کثیر کو صرف چند لفظوں میں ادا کرنا، ایک ہی شعر میں طویل مضمون کو بیان کر دینا، دو تین مصرعوں کے ذریعے وہی درد و اثر پیدا کرنا جو طویل نظموں سے مترتب ہوتا ہے سخت دشوار ہے۔

اوپر جو کچھ بیان ہوا وہ ایک ایسے وسیع خیال وروشن ضمیر انگریز نقاد کی رائے ہے جس نے کبھی کوئی ونسلی تعصب کو اپنی صادق البیانی میں دخیل ہونے نہیں دیا۔ وہ جاپانی مختصر نظموں کی اثر آفرینی کی بیحد تعریف وتوصیف کرتا ہے۔ اگر اسے اُردو اور فارسی غزلوں کے دفتر بے پایاں سے تھوڑی سی بھی واقفیت ہوتی جس کا ہر شعر ایک وسیع مضمون کا اور ہر لفظ کثیر معانی کا حامل ہوتا ہے اور اثر کے لحاظ سے تیر ونشتر کا حکم رکھتا ہے تو وہ ہمارے شعرا کے دواوین کو مغربی شعرا کے لئے مشعلِ ہدایت قرار دیتا۔

انگلستان کے شعرا و ادبا مدتِ دراز تک یونانی ولاطینی سرچشموں سے سیراب ہوتے رہے لیکن مشرقی آفتاب ادب کی پیہم ضیا باریوں سے وہ مستفیض نہ ہوسکے۔ البتہ جب فزجیرلڈ نے عمر خیام کی مئے دوآتشہ کو مغربی ایریق میں ڈھالا تو دادایانِ فرنگ اس کے شیفتہ وگرویدہ تو ضرور بنے لیکن اس کی میناگداز تندی کی تاب نہ لاسکے چنانچہ کسی انگریز شاعر کو آزادانہ رباعیاں لکھنے کی جرات نہ ہوئی۔ اسی طرح جب پروفیسر براؤن اور ڈاکٹر نکلسن نے ایرانی ادب وشاعری سے اہلِ انگلستان کو روشناس کرایا تو اُن کی آنکھیں مشرقی شاعری کی چمک دمک سے خیرہ ہوگئیں، لیکن کسی کو غزل سرائی کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ لفکاڈیو ہرن نے اسے انگریزی زبان کی کم مائگی اور انگریز شعرا کی نااہلیت پر محمول کیا ہے۔ اس نقاد کا خیال صحیح ہو یا غلط لیکن اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ معانی کثیر کو صرف دو مصرعوں میں اداکردینا گویا دریا کو کوزے میں بند کرنا ہے جو ہر کس وناکس کا کام نہیں ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ انگریزی جیسی ترقی یافتہ اور پُرانی زبان جس کمال کوزہ کرنے سے قاصر ہے اُس میں چندروز کی اُردو زبان نے کیسے اتنی کامیابی حاصل کرلی۔ اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ انگریزی ایک جبینی زبان ہے جس کو سیاسی اقتدار کی وجہ سے اتنی وسعت وترقی حاصل ہوئی ہے۔ وہ شاعری سے زیادہ علم وحکمت کی حامل ہے۔ لیکن اُردو ایک مجلسی زبان ہے جسکو شعر وشاعری سے گہرا تعلق ہے۔ وہ شاعروں ہی کے آغوش محبت اور دامن عاطفت میں پرورش پاکر جوان ہوئی ہے۔ انگریزی زبان مختلف علوم وفنون اور حکمت وفلسفہ کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ لیکن مدت تک اُردو کا مشغلہ صرف شعر وشاعری رہا کی ہے۔ لہذا حکیمانہ زبان اور شاعرانہ زبان میں جو فرق ہونا چاہیئے وہ انگریزی اور اُردو زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختصر گوئی کے جس روشن کارنامہ کو پیش کرنے سے چھ صدیوں کی انگریزی شاعری قاصر رہی ہے وہ ابتدا ہی سے دوصد سالہ اُردو شاعری کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے۔ واضح رہے کہ زبانوں کی ابتدا کے متعلق بہت سے تاریخی نزاعی مسئلے پیدا ہوگئے ہیں۔ اِن نزاعات سے قطع نظر کرکے عام خیال کے مطابق

اگر چاسر کو انگریزی شاعری کا اور ولی کو اُردو شاعری کا ابوالآبا تسلیم کر لیا جائے تو اوّل الذکر شاعری کی عمر چھ سو سال کی اور ثانی الذکر کی عمر تقریباً دو سو سال کی ہوئی۔ الغرض دو صدیوں کی اُردو زبان نے مختصر گوئی اور غزل سرائی میں جو نام پیدا کیا وہ چھ صدیوں کی انگریزی شاعری کے لئے باعث رشک ہے۔ اُردو شعرا اپنے محیر العقول کارنامے پر جسقدر فخر و ناز کریں کم ہے۔ علاوہ بریں اُردو اور فارسی کے شعرا صدیوں تک غزل سرائی کرتے رہے جس کی وجہ سے غزل کی ایک خاص زبان بن گئی۔ اس کی تلمیحات، استعارات، تشبیہات اور اصطلاحات مقرر ہو گئے جن کے استعمال سے اظہارِ خیال میں بے حد سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے ماسوا شعر میں حسن، معنویت، اختصار اور اثر پیدا کرنے کے لئے بھی ان مقررہ الفاظ سے بڑی مدد ملتی ہے۔ ہر لفظ میں معنی کی ایک ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ ایک لفظ سنکر ذہن میں ہزاروں خیالات آنے لگتے ہیں جو اُس لفظ سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ مثلاً "گُل" سن کر ہمارا ذہن صرف ایک خاص قسم کے پھول ہی کی طرف منتقل نہیں ہوتا، بلکہ خوبصورتی، نزاکت، نفاست، حسن و جمال، بوے وفا وغیرہ کے علاوہ جاہ و حشم، دولت و ثروت، اقتدار و اختیار وغیرہ کی بے ثباتی و بے اعتباری کا نقشہ بھی ہماری چشمِ تخیل کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ اسی طرح سیکڑوں لفظ ہیں جو اپنے لغوی معنی بتانے کے علاوہ بہت سے اوصاف خصوصیات اور واقعات کا مجموعہ بن گئے ہیں۔ ان الفاظ کی مدد سے وسیع سے وسیع خیالات اور طویل سے طویل مضامین بھی صرف ایک شعر میں ادا کر دیئے جاتے ہیں لیکن جس زبان میں اس قسم کے الفاظ کی کمی ہے اس میں کسی مضمون کو ادا کرنے کے لئے طویل نظمیں لکھنی پڑتی ہیں۔

(باقی)

محمد حسین ادیب

رباعی

دل میری جب کہ ڈھونڈتی ہے احباب
سرگشتوں کو ڈھونڈتی ہے وہ ڈھونڈتے ہیں احباب
پھر کیوں نہیں مجھ کو وصل اک لحظہ وار
پھر کیوں یہ تیری جستجو ہے احباب

ندا نیم

غزل

وحدتِ مطلق جو گرمِ جلوہ آرائی ہوئی
کثرتِ عالم نثارِ شانِ یکتائی ہوئی

وہ تب و تابِ محبت جان کو آئی ہوئی
وہ تری شوقِ نہاں کی آگ بھڑکائی ہوئی

وہ تمنا فرطِ مایوسی کے ہاتھوں جاں بلب
وہ امیدِ زندگی پر مُردنی چھائی ہوئی

ہائے! وہ رحمت کہ جب تک دل کہیں آیا نہ تھا
ہائے! وہ ساعت کہ جب تم سے شناسائی ہوئی

ابتدائے شوقِ بے صبر و سکوں کا کیا قصور
انتہائے یاس وجہِ ناشکیبائی ہوئی

حیف! اے اظہارِ حرفِ شوق کے اقدام حیف
وہ نظر جھینپی ہوئی، وہ آنکھ شرمائی ہوئی

بے ضرورت اہتمامِ پردہ کر کے کیا ملا
اور تیرا نام نکلا، اور رسوائی ہوئی

اب کہاں وہ سوزِ الفت اب کہاں وہ اُس کی آگ
ایک چنگاری سی ہے اور وہ بھی کجلائی ہوئی

مرحبا اے ساقیٔ روزِ ازل! صد مرحبا
محفلیں چھک چھک اُٹھیں وہ بادہ پیمائی ہوئی

اک تمہیں آزاد! اپنے دل کی دل ہی میں لیے چلے
ورنہ اُس سرکار میں دُنیا کی شنوائی ہوئی

حکیم آزاد انصاری

والٹیر پر ایک نظر

والٹیر ایک دفعہ اپنے ایک ڈرامے کی آزمائش کے دوران میں ایک ایکٹرس کو بار بار یہ کہہ رہا تھا: "اور کوشش کرو، ابھی بہت کسر باقی ہے۔ سامعین پر دردناک حالت جبھی طاری ہوگی کہ تمہارے الفاظ درد سے لبریز ہوں"! وہ بول اٹھی "جذبات کو اس قدر بھڑکانے کے لئے تو لازم ہے کہ خود شیطان مجھ میں حلول کر جائے"! والٹیر نے جواب دیا "ہر آرٹ میں کامیاب ہونے کے لئے لازم ہے کہ شیطان خود تمہارے جسم میں حلول کر جائے"! تمام نقاد اس امر پر متفق ہیں کہ والٹیر نے اِس ضرورت کو بدرجۂ اتم پورا کیا۔ اُس کے وجود میں شیطان تھا۔ والٹیر وہ آدمی تھا جسے شیطان نے سب اختیارات دے رکھے تھے۔

والٹیر بدصورت، لااُبالی، خود پسند، فاحش، اور ہرزہ سرا تھا، بعض دفعہ بددیانت بھی۔ اُس میں اپنے زمانے کے تمام عیب تھے۔ شاید ہی کوئی عیب اُس نے چھوڑا ہو۔ مگر اس کے باوجود، یہی والٹیر بے انتہا مہربان اور ہمدرد تھا۔ وہ زور و زر صرف کرنے میں بے حد فراخ دل تھا۔ دوستوں کی مدد اُسی دھڑتے سے کرتا تھا جس سے دشمنوں پر سختی۔ اپنے قلم کی ایک جنبش سے ہلاک کر دیتا تھا، مگر مصالحت کا ہاتھ بڑھتا دیکھتے ہی بے ہتھیار ہو جاتا تھا۔

انسان بھی کیسا مجموعۂ اضداد ہے!

مگر یہ تمام خصوصیات (بُری اور اچھی دونوں) ثانوی حیثیت رکھتی ہیں حقیقی والٹیر ان میں جلوہ گر نہیں تھا۔ اصلی اور بنیادی چیز جو اُس میں تھی وہ اس کے دماغ کی سدا بہار زرخیزی اور روشن ضمیری تھی۔ اُس نے ننّوے کتابیں تصنیف کیں، جن کا ہر صفحہ زریں ہے۔ یہ کتابیں رنگارنگ کے مضامین کو چھیڑتی ہوئی اس عمدگی سے بڑھتی ہیں جس طرح ایک انسائیکلو پیڈیا! وہ کہتا ہے "میرا پیشہ ہی یہ ہے کہ جو کچھ خیال کروں اُسے ظاہر کر دوں"۔ اُس کا ہر خیال قابلِ اظہار تھا۔ کیونکہ اُس نے جو کچھ کہا ہے، وہ واقعی لاجواب ہے۔

اگر آج ہم اُس کی تصانیف نہیں پڑھتے، (حالانکہ ناطول ایسے لوگ اُسی کی کتابوں پر دیدہ ریزی کر کر کے اعلےٰ درجے کے مصنف بن گئے) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دینیات کی وہ "لڑائیاں" جو والٹیر ہماری خاطر لڑتا رہا، زمانۂ

حال کے لئے دلچسپ نہیں رہیں۔ ہم اب اَور ہی ہنگاموں میں مبتلا ہیں۔ ہمیں عالمِ عقبیٰ کے "جغرافیہ" کی بجائے، موجودہ دنیا کے "معاشیات" کا کڑا سبق درپیش ہے + والٹیر نے اوہامِ باطلہ پر جو مکمل فتح حاصل کی تھی اُس نے ہمارے لئے وہ تمام مسائل مردہ کر دیئے ہیں جو اُس کے لئے زندہ تھے + والٹیر کی شہرت بہت حد تک اُس کی لاجواب گفتگو کی وجہ سے تھی، مگر "لکھے ہوئے الفاظ تو رہ جاتے ہیں اور بولے ہوئے فنا ہو جاتے ہیں"۔ یہی حال والٹیر کا ہؤا۔ جو کچھ ہمارے لئے بچا ہے اُس میں والٹیر کا پوست اور خون تو ہے مگر اس کی پاکیزہ حرارت نہیں۔ بہرحال زمانے کے دھندلے شیشے سے بھی جب ہم اُسے دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں غضب کا انسان نظر آتا ہے۔ مجسم ذہانت! غصّے کو ہنسی میں اور "نار کو نور" میں تبدیل کرتا چلا جاتا ہے۔ اُس کے وجود کی تخمیر ہوا اور آتش سے ہوئی تھی۔ وہ دنیا بھر سے زیادہ مستقل مزاج اور جوشیلا تھا۔ جن عناصر سے اُس کا جسم بنا تھا وہ باقی دنیا کے تمام عناصر سے زیادہ بے قرار اور زیادہ لطیف تھے۔ کوئی ایسا آدمی نہیں جس کے دل کی مشین اُس سے زیادہ نازک ہو یا جس کا دماغی توازن بیک وقت اُس سے زیادہ قائم بھی ہو اور متغیر بھی!

یقیناً اُس نے اپنے ہر معصر سے زیادہ جفاکشی کی اور زیادہ کامیابی بھی حاصل کی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "مصروف نہ ہونا، یا زندہ نہ رہنا دونوں برابر ہیں" + "سب لوگ نیک ہیں، سوائے اُن کے جو بیکار ہیں" اس کا سیکرٹری کہتا ہے کہ والٹیر صرف وقت کے مقابلے میں بخیل تھا۔ "اس دنیا میں زندگی کو قابلِ برداشت بنانے کے لئے لازم ہے کہ انسان جہاں تک ممکن ہو کام میں مصروف رہے" + "میری عمر جتنی بڑھتی جاتی ہے مجھے کام کی اہمیت اتنی ہی زیادہ معلوم ہوتی ہے" + بالآخر "کام" دنیا کی سب سے بڑی خوشی بن جاتا ہے اور دنیا کے تمام فریب اور سراب اُس میں کھو جاتے ہیں + اگر تم خودکشی سے بچنا چاہتے ہو تو ہر وقت کچھ نہ کچھ ضرور کرتے رہو + خودکشی والٹیر کو ہمیشہ اپنی طرف کھینچتی رہتی ہوگی۔ کیونکہ وہ ہمیشہ کام میں مصروف رہتا تھا + وہ زندگی کی ایک لہر تھا جس نے سارے زمانے کو زندگی سے شاداب کر دیا + وہ دنیا کی ایک بہترین صدی (۱۶۹۴ - ۱۷۷۸) کا ہم عہد تھا۔ بلکہ اس کا جوہر اور روحِ رواں! —— وکٹر ہیوگو کہتا ہے کہ "والٹیر کا نام گویا اٹھارویں صدی کی تمام خصوصیات کا خلاصہ ہے!"

اٹلی میں نشاۃِ جدید، جرمنی میں تحریکِ اجتہاد اور فرانس میں والٹیر پیدا ہؤا۔ وہ اپنے زمانے کے لئے نشاۃِ جدید بھی تھا، تحریکِ اجتہاد بھی اور بہت حد تک انقلابِ عظیم بھی + اُس میں جذباتِ تشکک اور ظرافت ملے ہوئے تھے۔ اُس نے توہم پرستی اور فساد کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ جس میں وہ لو تھر اور کلوِن کی نسبت

زیادہ جوانمردی سے لڑا اور زیادہ کامیاب بھی ہوا + اُس نے وہ بارود تیار کیا جس سے متاخرین نے پُرانے طرزِ حکومت کو اُڑا ڈالا +

اگر ہم مصنفین کی عظمت کا فیصلہ اُن کی کامیابی سے کریں تو والٹیر بلاشبہ جدید یورپ کا مصنفِ اعظم ثابت ہوگا + قدرت نے اُسے زندگی کے تراسی سال دیئے تاکہ وہ "جہالتِ کہنہ" کو آہستہ آہستہ تباہ کرسکے. زمانے کو ہزیمت دینے کے لئے اُس کے پاس وقت تھا۔ اور جب وہ گرا تو وہی فاتح تھا +

کبھی کسی مصنف کا اپنی زندگی میں اتنا دبدبہ نہیں ہوا۔ باوجود اس امر کے کہ وہ قید ہوا، جلا وطن کیا گیا اُس کی ہر کتاب ضبط کرلی گئی، مگر پھر بھی اُس نے اپنا پیغام لوگوں تک پہنچانے کے لئے کئی ایسے طریقے نکال رکھے تھے کہ آخر کار بادشاہ، پوپ اور شہنشاہ اُس کی خوشامد کرنے پہ مجبور ہوگئے۔ تخت اُس سے کانپ اُٹھے اور دنیا اُس کا ایک ایک لفظ سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہوگئی۔ یہ ایک ایسا زمانہ تھا جس میں بے شمار چیزیں کسی تباہ کن طاقت کو بُلا رہی تھیں۔ نیٹشے پکار اُٹھا، "ضرورت ہے کہ ہنستے ہوئے بھیڑیے آئیں"۔ ہاں! والٹیر آیا اور ہنسی سی تباہی لاتا گیا + والٹیر اور روسو دو آوازیں تھیں اُس بڑے عمل کی، جو اقتصادی اور سیاسی طاقت کو امارت اور ملوکیت کے ہاتھوں سے نکال کر جمہوریت کے سپرد کر رہا تھا + جب ایک اُٹھتی ہوئی قوم پُرانے رسوم و قیود اور قانونِ وقت سے تنگ آجاتی ہے تو وہ رسم کے خلاف، عقل سے اپیل کرتی ہے، اور قانون کے خلاف فطرت سے + چنانچہ اس زمانے کے لوگ جو شہنشاہیت کے ہاتھوں نالاں تھے انہوں نے والٹیر کی عقلیت Rationalism اور روسو کی فطریت Naturalism کی حمایت کی انہوں نے اپنے جذبات کو پُرانے رسم و رواج کے خلاف مشتعل کرکے زیادہ قوی بنالیا، اور اس طرح ان کے دل و دماغ انقلابِ فرانس کے آنے سے پہلے مشکلات اور انقلابات کے لئے بالکل تیار ہو چکے تھے + روسو اور والٹیر انقلابِ فرانس کا باعث نہیں تھے وہ خود اس انقلاب کی طرح اُن قوتوں اور تحریکوں کا ماحصل تھے جو فرانس کی اقتصادی اور سیاسی زندگی کی تہ میں موجزن تھیں۔ والٹیر اور روسو انقلابِ فرانس کے آتش فشاں پہاڑ کی آگ اور دھوئیں کے ساتھ ساتھ روشنی اور چمک کا کام دے رہے تھے + انسان کے جذبات اور خواہشات آہستہ آہستہ خود بخود خیالات کی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔ فلسفہ تاریخ سے اُسی طرح پیدا ہوتا ہے جس طرح دلائل خواہشات سے۔ دونوں صورتوں میں ایک نامعلوم عمل اندر ہی اندر سے وہ خیال پیدا کردیتا ہے جو بعد میں سطح پر نمودار ہوکر اہمیت حاصل کرلیتا ہے یہاں تک کہ لوگ اُس اندرونی کیفیت اور حقیقی سبب کو نظر انداز کر دیتے ہیں، جس سے یہ خیال

پیدا ہوتا ہے مگر اس قدر پیچھے مڑکر اتنی گہری نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں جس سے فلسفہ کی مبالغہ آمیز طاقت کی قلعی کھل جائے۔

روسو اور والٹیر کی تحریریں دیکھ کر لوئی پانز دہم کہہ اٹھا: "ان دو آدمیوں نے فرانس کو تباہ کر دیا ہے!" نپولین کہا کرتا تھا کہ اگر حکومت صحافت کو قابو میں لاسکتی تو شاید بچ جاتی۔ توپوں کی آمد نے نظامِ اقطاعی Feudal System کو تباہ کیا تھا اب قلم کی آمد موجودہ معاشرتی نظام کو مٹا کر رہے گی۔ والٹیر کا قول ہے کہ "کتابیں دنیا پر حکومت کرتی ہیں، کم از کم ان قوموں پر جن کی زبان زندہ ہے۔ دوسری اقوام تو خیر کسی شمار ہی میں نہیں۔ تعلیم سے بڑھ کر کوئی چیز ملک کو آزاد نہیں کرا سکتی۔ جب ایک دفعہ کسی قوم میں آزاد خیالی پیدا ہو جائے تو کوئی طاقت اسے نہیں روک سکتی" والٹیر کی بدولت فرانس میں آزاد خیالی پیدا ہو گئی تھی۔

(ترجمہ) نبی احمد

پروازِ محبت

شمع کے بجھنے پر جس طرح روشنی ظلمت میں تبدیل ہو جاتی ہے ——

اور بادلوں کے پھٹنے پر قوسِ قزح کی رنگینیاں فنا ہو جاتی ہیں ——

اُسی طرح، ہاں اُسی طرح دوست! محبت کی باتیں بھی روح کی خوابیدگی پر دل سے فراموش ہو جاتی ہیں

جس طرح رباب کے باریک تار ٹوٹ کر اُس کے سریلے نغموں کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیتے ہیں

—— اُسی طرح دوست! عشق کی سہانی راتیں بھی ایک عرصے کے بعد گزری ہوئی داستانیں رہ جاتی ہیں۔

جس طرح دل خوش کُن موسیقی اور آنکھوں کو چکاچوند کر دینے والی روشنی رباب اور شمع کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکتیں اُسی طرح ٹوٹے ہوئے دل کی دھیمی صدائیں روح کی خاموشی میں نغمہ پیدا نہیں کر سکتیں ——

ہاں نغمے پھر بلند ہوتے ہیں، مگر ماتمی گیت بن کر!

نسیمیں پھر چلتی ہیں، مگر ویرانوں کی ہوائیں بن کر!

محبت اب اجڑی ہوئی بستیوں کے جنگلی پھولوں سے کھیلتی ہے۔

(ترجمہ از شیلے) صحرانورد

بلبل اور چنڈول

چنڈول کی طرب انگیز صدا کس قدر عوش آئند معلوم ہوتی ہے، جب وہ اپنے شیریں نغمے گاکر نورِ سحر کی آمد کا پیغام دیتا ہے۔

لیکن اس سے کہیں زیادہ شیریں، کہیں زیادہ پُرسکون وہ افسردہ گیت ہے جو ہمارے المناک جذبات کو تسکین دینے کے لئے دھندلکے کے جھلملاتے ہوئے ستاروں کی دھیمی سی روشنی میں بلند ہوتا ہے۔

آہ بلبل! اُسے کیا ہوگیا۔ کوئی نہیں جان سکتا کہ اُس کے دل کے ساز پر لمحہ بہ لمحہ غم کی چوٹ پڑتی ہے یا اُس کی روح کی مسرت راگنی بن کر اس کے لبوں تک آتی ہے۔

کیونکہ آج تک دنیا میں کسی نے مسرت کی ایسی آواز نہیں سُنی جو حزن سے اس قدر ملتی جلتی ہو۔

چنڈول جس کی طمانیت ہمیشہ اُسے بلندیوں پر محوِ پرواز رکھتی ہے، جہاں پستی کا کوئی خیال اُس کے قریب نہیں آنے پاتا، چہک چہک کر نیلے آسمان کو اپنے نغمے سناتا ہے، اور صبح کی روشنی کو جو اس کی شیریں زبان سے خوش آمدید سننے کے لئے اُفق سے جھانکتی ہے۔

اتنا ہی پیارا، اتنا ہی سرور آمیز، اتنا ہی بلند آہنگ بلبل کا گیت ہے اور طمانیت کے وہی جذبات اس کے ننھے دل میں بھی متحرک ہیں جن سے چنڈول کے نغمے معمور ہوتے ہیں۔

لیکن گاہ بگاہ آہ کی ایک نامعلوم سی آواز اس کی بے پایاں مسرت کو چیر کر اس کے لبوں سے نکل جاتی ہے۔

ہاں اس لئے کہ چنڈول کے آزادانہ نغموں کی تخلیق آسمان کی بلندیوں پر ہوتی ہے اور بلبل کے گیت زمین کی پستی سے بلند ہوتے ہیں۔

پھر بھی دن اور رات وہ اپنا راگ گائے جاتی ہے، تمام رنج والم کو بھول جانے کے لئے۔

کیونکہ مسرت کی گھڑیاں بھی رات کے ساتھ ہی گذر جائیں گی، اور نہیں معلوم صبح اپنے ساتھ کیا کیا نئے غم لے کر بیدار ہوگی۔

(ہارٹلے کولرج)

ز۔ ب۔

تمنّائے حشر

دلِ محزوں کو تیری یاد سے محروم رکھتا ہے
مٹا اس ماسوا کو یہ مجھے مغموم رکھتا ہے

مجھے اک نفسِ ناہنجار کا محکوم رکھتا ہے
مرا دل زہرِ غفلت سے سدا مسموم رکھتا ہے

مٹا اس ماسوا کو یہ مجھے مغموم رکھتا ہے
دلِ محزوں کو تیری یاد سے محروم رکھتا ہے

دیا ہے پھینک یوں شور و شغب کے اس جہاں میں کیوں
مقید کر دیا مجھ کو زمین و آسماں میں کیوں

نہیں ہے آہ جمعیت مرے قلبِ تپاں میں کیوں
نظر آتا نہیں جلوہ ترا اس گلستاں میں کیوں

مٹا اس ماسوا کو یہ مجھے مغموم رکھتا ہے
دلِ محزوں کو تیری یاد سے محروم رکھتا ہے

ڈبویا کس لئے ہے مجھ کو لا کر قعرِ دریا میں
کیا ہے مبتلا کیوں مجھ کو کثرت گاہِ دنیا میں

مرا دل مضمحل رہتا ہے اس طوفانِ برپا میں
جگہ میرے لئے کیا تھی نہ منزل گاہِ عنقا میں

مٹا اس ماسوا کو یہ مجھے مغموم رکھتا ہے
دلِ محزوں کو تیری یاد سے محروم رکھتا ہے

ح - ب

جذبۂ بے اختیار

"میں تین بجے تمہارا انتظار کروں گی"

"شکریہ! میں ضرور پہنچ جاؤں گا"

اِس کے بعد میں نے رسیور رکھ دیا۔ نینڈ کی اِس خلافِ توقع گفتگو پر مجھے سخت تعجب تھا۔

ایک سال ہوا جب میں نے اپنا کاروبار چھوڑ کر اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب وہ تمام واقعات میری آنکھوں کے آگے پھر گئے۔ مجھے اُس کے آخری الفاظ یاد آئے "اگر تم مجھ سے شادی کرنا پسند نہیں کرتیں تو شاید معمولی تعلقات بھی میں تمہارے ساتھ قائم نہ رکھ سکوں"

نیڈ یہ کہہ کر چلا گیا۔ میں نے اُس کے جانے کی بالکل پروا نہ کی۔ کیونکہ میں یہ نہ سمجھتی تھی کہ وہ آئندہ مجھ سے بات ہی نہ کرے گا۔ مگر ایک سال گذر گیا اور آج سے قبل کبھی اس نے مجھ سے گفتگو نہ کی۔ اِس وقت ٹیلیفون پر اُس کی آواز سن کر میرا دم گھٹنے لگا۔

"نینی۔ تم کیسی ہو؟" یہ اس نے کچھ اِس انداز سے پوچھا گویا وہ کل یا پرسوں ہی مجھ سے مل کر گیا ہے۔ اس کے بعد ذرا لاپروائی سے کہنے لگا "گذشتہ گرمیوں میں میں پہاڑ پر گیا تھا۔ وہاں اتفاقاً شکاگو کی ایک لڑکی میری نارتھ سے میری ملاقات ہوئی، اور اب اُسی سے میری نسبت بھی قرار پا گئی ہے" میں نے اسے مبارکباد دی، مگر اُس نے گویا سنا ہی نہیں اور برابر اپنے جوش میں کہتا رہا "اب جلد میری شادی بھی ہونے والی ہے"

"نینی کیا تم میری مدد کر سکتی ہو؟ میں بہت پریشان ہوں۔ تمہاری مدد کی ضرورت ہے"

اب اُس کی آواز درد سے بھری ہوئی تھی۔ میری زبان سے بے اختیار نکلا "تم آ کر مجھ سے مل جاؤ"

نیڈ کی عادت سے میں خوب واقف تھی۔ وہ کسی کام میں تاخیر پسند نہ کرتا تھا۔ چنانچہ اس وقت بھی اس نے ایک دم کہا "آج شام کو"

میں نے اس سے ملنے کی تیاری شروع کی۔ دل میں سوچ رہی تھی کیا نیڈ اب تک ویسا ہی ہوگا؟ وہی پرانی تراش کے کپڑے پہنتا ہوگا؟ اب بھی اس کا یہی خیال ہوگا کہ عورتیں صرف خانہ داری کے لئے پیدا کی گئی

ہیں؟ اب تک وہ یہ بھی نہ سمجھ سکا ہوگا کہ میں نے کیوں اُس کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا؟

وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ مرد کی سچی محبت کے علاوہ عورت کو کونسی چیز عزیز تر ہو سکتی ہے؟ کیا اس محبت کی حفاظت اور اس کے برقرار رکھنے کی کوشش اُس کے لئے کافی مشغلہ نہیں ہے؟ کیا اس کے بعد بھی دنیا میں اسے کسی چیز کی تمنا ہو سکتی ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیوں مردوں کی طرح فکرِ معاش میں گرفتار رہے جبکہ اس کی ہستی پیدا ہی اس لئے کی گئی ہے کہ گھر کی چار دیواری میں حکمرانی کرے اور زندگی کو خوشگوار بنائے؟

لیکن میں انقلاباتِ زمانہ اور گردشِ ایام کو اپنی قوتِ بازو سے زیر کر کے ایک فاتحانہ مسرت محسوس کرتی تھی۔ مجھے مصارف و حوادث کا مقابلہ کرنے میں ایک خاص لطف حاصل ہوتا تھا۔ اُسے میری یہ عادت پسند نہ تھی۔ وہ میری ناز تھ سے شادی کر رہا تھا۔ شاید یہ لڑکی میرے بالکل برعکس ہوگی۔ میں دل میں اس کی ایک خیالی تصویر کھینچ رہی تھی۔ اور جس قدر میں اس میں کامیاب ہوتی جاتی تھی اسی قدر میرا نیڈ سے ملنے کا اشتیاق بھی بڑھتا جاتا تھا۔ وقت کاٹے نہ کٹتا تھا۔ شاید آج تین ہی نہ بجیں گے۔

"ابھی تک تم وہی تمسکات کا کام کرتی ہو؟" ایک گھنٹے کے بعد وہ میرے سامنے کھڑا تھا اُس کی نیلگوں بھوری آنکھیں ایک پُر کیف مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھیں۔ گویا معلوم کرنا چاہتی تھیں کہ کیا میں درحقیقت اس کو بالکل فراموش کر چکی ہوں۔

میرا دل گھبرانے لگا۔ میں نے بہ وقت اپنے جذبات کو دبایا اور ایک ظاہری لاپروائی سے جواب دیا۔ "بیشک۔ بلکہ اب تو میرا کام اور زیادہ بڑھ گیا ہے"۔

ماشاء اللہ"۔ اس نے تیزی سے کہا "کیا تمہارا تمام وقت اسی میں صرف ہو جاتا ہے؟ کیا تم میرے لئے تھوڑا سا وقت نہ نکال سکو گی"؟

"نیڈ، تمہارے لئے میں سب کچھ کر سکتی ہوں"۔

"اچھا، دیکھو" اس نے کہا "میرا شروع سے یہ خیال تھا کہ پہلے دلہن کو چند ہفتوں کے لئے اپنے نئے مکان میں لاکر اُتاروں اور اس کے بعد یہاں سے ہم سیر کو جائیں۔ میرا یہ خیال مریم کو بھی پسند آیا۔ لیکن چونکہ اتفاقاً اس کی ماں بیمار ہو گئی ہے وہ اپنے لئے نیا مکان آراستہ کرنے کے لئے نہیں آ سکتی۔ مجھے شادی ملتوی کرنی پڑے گی"۔ پھر کچھ مسکرا کر کہا "اور میں ہرگز یہ پسند نہیں کرتا۔ غالباً اب تم سمجھ گئی ہوگی"۔

"تمہارا مطلب یہ ہے کہ اب مکان تمہیں خود آراستہ کرنا پڑے گا؟"

وہ کرسی چھوڑ کر میرے سامنے آکھڑا ہوا۔ اور کہنے لگا "ہاں زینی۔ کیا تم مجھے مدد نہ دوگی؟"

"ہیں! یہ ناممکن ہے"

"آخر کیوں؟ ناممکن کیوں ہے؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتی"

"دیکھو زینی، بیکار باتیں مت کرو۔ مجھے وحشت ہوتی ہے"

"نیڈ، آخر تم مجھ سے چاہتے کیا ہو؟"

"میں سارا کام تم پر ڈالنا نہیں چاہتا، نہ یہ کہتا ہوں کہ تم اپنے ہاتھ سے کمرے ٹھیک کرو۔ صرف تمہاری مدد چاہتا ہوں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ تم چل کر اس میں زندگی کی ایک روح پھونک دو۔ زینی، کیا تم نہ چلوگی"؟

میں اُس کی اس خواہش کو حقارت سے دیکھتی تھی۔ ایسے ایک ہی سال قبل اُس نے مجھ سے شادی کی تمنا کی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا "تم دنیا میں مجھے سب سے زیادہ عزیز ہو"۔ لیکن اب وہ کسی اور کی محبت میں گرفتار ہو کر نئی آئی پرانی کو دور کرو' کی صداقت کا ثبوت دے رہا تھا۔ اِس سے زیادہ اَور کیا حماقت ہوسکتی ہے کہ وہ میرے پاس اس قسم کی خواہش سے کرآئے۔ مجھے کیا غرض تھی کہ ایک دوسری لڑکی کے لئے مکان آراستہ کرتی۔ لیکن اُس کی وہی نیلگوں بھوری آنکھیں مجبور کئے دیتی تھیں، اور مجھے کہنا پڑا "اچھا، میں جتنا وقت بھی نکال سکتی ہوں تمہارے لئے نکالوں گی۔ وقت کی مجھے زیادہ پروا بھی نہیں، البتہ یہ خیال ہے کہ میں نے کبھی اُس لڑکی کو نہیں دیکھا، نہ میں اُس کی طبیعت اور اس کے مذاق سے واقف ہوں، خدا معلوم وہ کس قسم کی چیزیں زیادہ پسند کرتی ہے"

"اوہ، اس کا خیال نہ کرو بلکہ پہلے مکان دیکھ لو۔ یہ میرا آبائی مکان ہے۔ موٹر موجود ہے۔ چلو، ابھی میرے ساتھ چلو"

"نہیں میں اس وقت نہیں جاسکتی۔ مجھے بہت ضروری کام ہے"

لیکن میرے انکار کی اُس نے پروا نہ کی اور برابر باتیں کرتا رہا "مکان آراستہ کرنے میں زیادہ وقت نہ ہوگی۔ پُرانا مکان ہے اور اسی لحاظ سے ہمیں سامان خریدنا پڑے گا۔ ضروری، کارآمد اور خوبصورت پُرانی چیزیں۔ اس کے لئے مجھے تم سے بہتر آدمی نظر نہیں آتا" اُس وقت اس کی آنکھیں کچھ ایسی بے تعلق معلوم ہوتی تھیں گویا وہ کسی اجنبی کو دیکھ رہی ہیں۔

"نیڈ، یہ ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے کیونکہ ممکن ہے وہ پسند ...."

نہیں، تم اس کا بالکل خیال نہ کرو۔ جلدی تیار ہو جاؤ اور چلو میں تمہیں مکان دکھلاؤں "آخر جانا تو تھا مجبوراً "اچھا" کہہ کر کپڑے بدلنے چلی گئی۔

چند ہی منٹ بعد وہ مجھے اپنی چھوٹی سی موٹر میں سوار ہونے میں مدد دے رہا تھا۔ یہ وہی پچھلے سال والی گاڑی تھی، جس کو دیکھتے ہی گذشتہ صحبتوں کی فراموش شدہ یاد یکدم تازہ ہوگئی۔ اسی موٹر میں اس کے ساتھ میں اکثر سیر کو جایا کرتی تھی۔ دعوتوں اور تماشوں میں شریک ہوکر ہم کتنے خوش واپس آیا کرتے تھے۔ کیسے خوشگوار تعلقات تھے۔ لیکن یہ وقت گذشتہ باتوں کی یاد تازہ کرنے کا نہ تھا، کیونکہ میں نیڈ کا آبائی مکان دیکھنے جارہی تھی۔ اور اس وقت مجھے اس کے آئندہ خوشگوار زمانے کی خیالی تصویر میں اس کے قدم بقدم رہنا تھا۔ اور یہ کوئی دشوار بات نہ تھی، نیڈ کی باتیں اس قدر پیاری اور دلفریب ہوتی تھیں کہ آدمی اپنے آپ کو بھول جاتا تھا۔ اب بھی میں اس کی باتوں میں اس قدر محو ہوگئی کہ مجھے دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ رہی۔ نہ وقت گزرتا معلوم ہوا نہ اس کا اندازہ کر سکی کہ ہم شہر سے کتنی دور نکل آئے ہیں۔ جب وہ شاہراہ کو چھوڑ کر ایک چھوٹی سی سڑک کی طرف مڑا تو میں ایک دم چونکی۔ نیڈ نے سڑک کے موڑ سے کچھ فاصلے پر ایک مکان کی طرف اشارہ کیا "یہ ہے"۔

ہم قریب پہنچے۔ مکان کی دیرینہ شان و عظمت دل پر ایک عجیب سکون بخش اثر ڈالتی تھی۔ اس کی خوبصورتی سے متاثر ہوکر میں نے بے اختیار کہا "یہ کیسی دلکش جگہ ہے!"

"کتنی دلفریب ہے! اس کی سڑکیں اور ایوان دیکھو! لیکن ٹھیرو پہلے اندرونی حصّہ دیکھ لو۔ اس پرانی عمارت کو موجودہ مذاق کے مطابق ترمیم کرانے میں مجھے کتنی کامیابی ہوئی ہے!"

باہر سے یہ عمارت بہت ہی پرانے طرز کی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن نیڈ نے مبالغہ سے کام نہیں لیا تھا۔ در حقیقت ان پختہ دیواروں کی آغوش میں اس نے موجودہ مذاق کے مطابق ایک مکمل اور آرام دہ مکان بنالیا تھا۔ اس نے فخریہ طور پر مجھ سے بیان کیا کہ یہ سب تبدیلیاں اس نے اپنی ہی نگرانی میں خود اپنی رائے سے کرائیں۔ مختلف کمروں میں جاکر میں نے محسوس کیا کہ اس نے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھا تھا اور ان تبدیلیوں کے باوجود مکان کی قدیم عظمت برقرار تھی۔ وہی شان و شوکت تھی۔ ایک عجیب خاموشی اور سکون چھایا ہوا تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں کی سادہ مگر دلاویز محرابیں اور آتشدان قدیم فن تعمیر کا نمونہ پیش کر رہے تھے۔

"نینی" اس نے کہا "اس مکان کی مرمت کرا کے مجھے جس قدر مسرت ہو رہی ہے شاید کوئی نئی عمارت بنوانے میں مجھے اتنی خوشی نہ ہوتی۔ جب میں یہاں آتا ہوں تو مجھے یہ مکان بالکل ایک ہمدم معلوم ہوتا ہے ایک مخلص اور دیرینہ

دوست جب میں بچہ تھا تو اس کے آتشدان کے آگے بیٹھکر کھیلا کرتا تھا۔ تمام رات پلنگ پر لیٹا ہوا اس کی چھتوں پر بارش کی آواز سنا کرتا تھا۔ اب یہ پھر آباد ہوگا۔ مجھے کس قدر خوشی ہورہی ہے۔ اس کی چھتیں اور آتشدان ..... یہ میرے لئے اور میں ان کے لئے "...... نیڈ مجھے اوپر لے گیا۔

جب ہم زینے کے سامنے والے بڑے کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے کہا "یہ میری کا کمرہ ہے۔ بس اس کو تم اپنے بہترین مذاق کا نمونہ بنادو۔ دیکھو اس کے برابر ہی ایک چھوٹا کمرہ بھی ہے اور اس کے عقب میں میرا کمرہ ہے "

مکان کی آرائش کا دل میں ایک خاکا قائم کرتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا "میری کو کونسے رنگ زیادہ پسند ہیں"؟ دماغ میں اب اس کی آرائش کی نئی نئی ترکیبیں آنے لگیں۔

اُس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر جواب دیا "معلوم نہیں البتہ اُس نے یہ ضرور کہا تھا کہ میں اپنی پسند سے کام لوں، اور مجھے تو سب رنگ ایک سے ہی معلوم ہوتے ہیں، تم اپنی ہی پسند کے موافق رنگ تجویز کرلو"

مجھے دیہاتی طرز آرائش بے حد پسند تھا اور میں نے وہی اختیار کیا۔ سونے کے کمرے کے لئے بہت ہلکے رنگ کی کوئی خوبصورت پھول دار چھینٹ، سیب کی طرح زردی مائل سبز اور سُرخ رنگ کی جس پر ہلکے آسمانی رنگ کے بیل بوٹے ہوں۔ نیچے کے کمروں کے لئے چمکدار کتھئی رنگ جس پر سفید سفید پھول کھلے ہوں۔

نیڈ نے کہا "جو جو چیزیں مناسب سمجھو خریدلو۔ یہ تم خود جانتی ہو کہ میں کتنا روپیہ اس پر آسانی سے صرف کرسکتا ہوں جہاں چاہو جاؤ، جس چیز کی ضرورت ہو منگالو۔ البتہ کسی مکان آراستہ کرنے والے کے ہاتھ میں نہ دیدینا۔ اگر ضرورت سمجھو تو اپنی ہدایت کے مطابق کسی کو کام کرنے پر مقرر کرلو۔

"اسے کب تک تیار ہوجانا چاہیئے "

اُس نے بڑے شوق سے کہا "نینی، کیا تم اسے جلدی تیار نہیں کرسکتیں" اُس کی حالت ایک پریشان بچے کی سی ہوگئی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں بالکل اسی میں منہمک ہوجاؤں اور جہاں تک جلد ہوسکے آراستہ کردوں۔ کہنے لگا "میرا خیال ہے کہ میں دو مہینے سے زیادہ انتظار نہ کرسکوں گا"

یہ تو کچھ زیادہ وقت نہیں ہے۔ اکثر مکان کی آرائش میں خلاف امید دیر ہوجایا کرتی ہے۔ لیکن میں کوشش کروں گی "

"کتنا عجیب اور خوبصورت مکان ہوگا!"

نیڈ نے جوش میں آکر میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے لیکن پھر یکایک کچھ پژمردہ سا ہو گیا اور کہنے لگا "تم اپنے کام کا کیا انتظام کرو گی"؟

درحقیقت مجھے بھی مکان سے کچھ ایسی دلچسپی ہو گئی تھی کہ اس وقت تک اپنے کام کا بالکل خیال نہ آیا۔ میں نے کچھ مسکرا کر جواب دیا۔ بلا کسانِ محبت کی دیوانگی بھی ایک بیماری ہے جو اُڑ کر لگتی ہے، اور بہت جلد اپنا اثر کر جاتی ہے اس کے مریض دنیا اور مافیہا سے بے خبر ہی رہتے ہیں، کام کا کسے ہوش رہتا ہے ...... نیڈ! دنیا میں ایک تم ہی ایسی ہستی ہو جس کے لئے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں "

"نینی، تم ہمیشہ ایک مہربان رفیق ہو"

اس وقت ہم مکان سے روانہ ہو رہے تھے۔ میں نے کچھ ہنس کر جواب دیا "اور تم ایک دلچسپ ساتھی"!

تمام راستہ ہم آرائش کے لئے مختلف رنگوں اور سامان پر گفتگو کرتے رہے۔ مجھے خود بہت زیادہ دلچسپی ہو گئی تھی ..... نیڈ کے جانے کے بعد میں تنہا رہ گئی۔ بیٹھ کر کچھ سوچنے لگی۔ اس کی گرمجوشی کا مجھ پر ایک خاص اثر تھا، اور میں ایک عجیب تکان سی محسوس کر رہی تھی۔

اب اس سو برس کے پُرانے مکان کی آرائش شروع ہوئی۔ مکان کے دلفریب ہونے میں کوئی شک نہ تھا۔ بالعموم قدیم مکان میں ایک عجیب کشش سی ہوتی ہے۔ اس سے آدمی کو ایک ہمدردی بھی ہو جاتی ہے جو ایک نئے مکان سے نہیں ہوتی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ پُرانے آبائی مکان میں ایک ماضی بھی خوابیدہ ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب یہ مکان آباد تھا۔ مگر اب اس کے مکین دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ کوئی پُرانا مکان جو ایسا خوبصورت ہو جیسا کہ یہ اور پھر عرصے سے خالی پڑا ہو تو اسے دوبارہ آباد کرنے کا خیال دل میں آنے کے بعد بہت جلد قوت پکڑ جاتا ہے ..... خود مکان بھی ایک مرتبہ آباد ہو چکنے کے بعد ہمیشہ اپنے مالک کی خدمت کرنے اور اُس کو آرام پہنچانے کا متمنی معلوم ہوتا ہے۔ ہمیشہ اپنا ایک حال قائم رکھنا چاہتا ہے ...... اور ایک مستقبل۔

نیڈ کے مکان سے بھی یہی صدائے خاموش بلند ہو رہی تھی۔ وہ زبانِ حال سے یہی التجا کر رہا تھا، اور میں اُسے پورا کرنے کے لئے ہمہ تن شوق بن گئی تھی۔ سب سے پہلے میں نے ہر کمرے کے لئے علیحدہ علیحدہ رنگ تجویز کئے۔ بہت محنت سے میں نے چمکتے ہوئے رنگوں کو اوپر اور نیچے کے کمروں کی دیواروں کے ہلکے اور فرش کے گہرے رنگوں کے درمیان ترتیب دے کر ایک مناسبت پیدا کی۔ ایک عجیب جاذبِ نظر تقابل پیدا ہو گیا۔ دیہات میں مکان کی آرائش میں اسی کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔

اس کے بعد سامانِ آرائش کا ناگزیر سوال پیش آیا پہلے نیچے کے کمروں کے لئے چیزیں تجویز کیں خوبصورت پُرانی قسم کی چیزیں مجھے بہت زیادہ پسند تھیں اور خوش قسمتی سے مجھے اِن چیزوں کے دستیاب ہونے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی کچھ تو میں نے بڑی بڑی دکانوں پر قیمتی سامانوں کی الماریوں میں سے نکالیں اور کچھ کباڑیوں کی معمولی دکانوں پر گرد سے اٹی ہوئی بیکار چیزوں کے ڈھیر میں سے تلاش کیں۔

اِس کاروبار میں اکثر میرا دل چاہتا تھا کہ کاش نیڈ بھی میرے ساتھ ہوتا - اِن پُرانی بیکار چیزوں کو الٹ پلٹ کرنے میں بہت سی عجیب اور کارآمد چیزیں نکلتیں، جنہیں دیکھ کر ایک خوشی سی ہوتی ایک مرتبہ میں شہر کی بڑی بڑی دکانوں پر پریشان ہوکر ناکام واپس آرہی تھی کہ گاؤں کے ایک کباڑی کی دکان پر مجھے بہت سی پُرانی چیزوں کے ڈھیر میں دبا ہوا ایک بکدار رگ نظر آیا - بہت ہی خوش رنگ تھا - اِن چیزوں کی تلاش میں مجھے کچھ ایسی دلچسپی ہوگئی تھی کہ گھنٹوں اپنے ذاتی کام کا خیال تک نہ آتا تھا - اور جب خیال آتا تو میں ایک دم چونک کر اپنے دفتر کی طرف بھاگتی، جہاں کم ازکم دس بارہ اہلِ معاملہ میرے منتظر نظر آتے - اور میں مکان کو فراموش کر دینے کی ایک ناکام کوشش کرتی -

کبھی کبھی نیڈ مجھ سے گفتگو کرنے کے خیال سے چائے پر آجاتا - میں اکثر بہکا کر یا بہلا کر اسے اپنی خرید کردہ نادرات دکھانے لے جاتی جب وہ میرے تجویز کئے ہوئے رنگوں اور اُن کی ترتیب کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتا اور میری خرید کردہ چیزوں کی تعریف کرتا تو میرا شوق بڑھ جاتا اور میں اَور زیادہ دلچسپی اور انہماک سے کام کرنے لگتی لیکن نیڈ نے خود کبھی کسی بات میں دخل نہیں دیا - اس نے شروع ہی سے ارادہ کر لیا تھا کہ جب تک مکان بالکل تیار نہ ہوجائے وہ اسے دیکھنے نہ جائے گا - وہ بہت استقلال سے اپنے اِس ارادے پر قائم رہا مکان کی اب کچھ حیثیت ہی اَور ہوگئی تھی - میں نے نیڈ کو وہاں لانے کی بہت کوشش کی مگر کبھی کامیاب نہ ہوئی - میرے اس شوق اور دلچسپی کو دیکھ کر وہ ایک عجیب انداز سے اپنا سر ہلاتا اور گردن کو کچھ خم دے کر صرف مسکرا دیتا -

نیڈ کا کمرہ میں نے آسانی سے تیار کر لیا لیکن میری کے کمرے کا مجھے بہت فکر تھا اور اس کے آراستہ کرنے میں بہت زیادہ دقت محسوس کر رہی تھی - میں نے کل سامان میں سے بہت سی شاندار قدیم خوبصورت اور نازک چیزیں پہلے ہی علیحدہ کر لی تھیں ..... اب رفتہ رفتہ میری کے کمرے کی آرائش میں نزاکت کی ایک خاص جھلک نمودار ہونے لگی ...... دونوں کمرے سادگی کی ایک تصویر تھے - دلکش -

مکان کی طرف توجہ بڑھنے سے دفتر جانا کم ہوگیا - روز اس میں ایک نئی کشش محسوس ہوتی تھی - آہستہ آہستہ آرائش تکمیل کو پہنچ گئی - جب میں اپنا کام ختم کر رہی تھی اور صرف چند آخری چیزوں کو ترتیب دینا باقی تھا تو مجھے ایک

سخت ناامیدی کا سامنا ہوا۔ نیڈ کو فوراً شادی کے لئے شکاگو جانا پڑا۔ میری دلی تمنا تھی کہ میں اسے لے جا کر خود تمام مکان دکھاؤں، لیکن اب اس کے بر آنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔

میرا کام ختم ہو گیا اور میں نے باہر نکل کر آہستہ سے دروازہ بند کیا اور چٹخنی قفل کے اندر آخری مرتبہ تالی گھمائی۔ دل میں ایک میٹھا سا درد محسوس ہونے لگا۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی گردن جھکائے جا رہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ نیڈ نے مکان کو "دیرینہ دوست" کہا تھا، شاید مجھے بھی اسی وجہ سے اس کے چھوڑنے میں تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔ درحقیقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی ہمدمِ دیرینہ سے رخصت ہو رہی ہوں۔ دل بیٹھا جا رہا تھا۔

دوسرے دن بار بار اس مکان کا خیال آیا۔ دل تھا کہ برابر اُس کی طرف کھچا جاتا تھا۔ مگر اب وہاں میرا کیا کام تھا۔ دفتر میں بالکل دل نہیں لگتا تھا۔ دو، تین، چار دن گذر گئے اور یہ خیال برابر بڑھتا ہی گیا۔ دفتر کا کام بالکل چوپٹ ہو گیا۔ شاید ایک مرتبہ پھر مکان ہو آنے سے طبیعت کچھ سنبھل جائے۔ لیکن میں جا بھی نہیں سکتی تھی۔ ممکن ہے کسی وجہ سے نیڈ جلد واپس آ گیا ہو، اس لئے وہاں جانا بھی مناسب نہ تھا۔

صبح سے شام تک میں کام میں مشغول رہنے کی کوشش کرتی لیکن مکان کسی طرح دل سے فراموش ہی نہ ہوتا ایک ایک چیز آنکھوں کے سامنے آتی۔ چھوٹے چھوٹے لکڑی کے خوبصورت اور چمکدار زینے، اور میری کا کمرہ، اس کی یاد سے ایک چوٹ سی لگتی اور میں دل پکڑ کر رہ جاتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے دل پر ان چیزوں کا اتنا اثر کیوں پڑا۔ ان میں ایسی کیا کشش تھی۔ میری تاجرانہ زندگی کو ان سے کیا تعلق۔ یہ سب ایک خانہ دار عورت کی دلچسپی کی چیزیں تھیں۔

اسی طرح ایک ہفتہ گذر گیا۔ شاید میری ساری زندگی میں مجھ پر ایسا سخت وقت نہ گزرا تھا۔ آخر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا ایک دن شام کو بہت جلد دفتر سے اٹھی اور سیدھی اِس "نئے پُرانے" مکان کی طرف روانہ ہوئی۔ سڑک کے موڑ پر پہنچی۔ اونچے اونچے سرسبز درختوں میں چھپے ہوئے سپید مکان پر نظر پڑتے ہی دل بھر آیا۔ "یہ میرا مکان ہے میرا! کیا میں نے اسے رہنے کے قابل نہیں بنا دیا؟ کیا میں نے اسے ایک آرام دہ گھر کی صورت میں تبدیل نہیں کر دیا؟ کیا اپنے ذاتی مذاق کے موافق میں نے اسے آراستہ نہیں کیا؟

خود بخود میری رفتار تیز ہوتی گئی یہاں تک میں بھاگنے لگی۔ بہت بے چینی اور بے صبری سے میں نے تالی گھما کر دروازہ کھولا۔ کواڑوں سے ایک ہلکی سی آواز نکلی۔ گویا وہ مجھ سے باتیں کرنا چاہتے تھے۔ چھوٹا سا سپید چمکدار زینہ میرے سامنے تھا۔ ...... نہیں، پہلے میں نیچے کے حصے سے رخصت ہو لوں۔

سامنے کے دروازے کے داہنی جانب سو برس کا پُرانا بیٹھنے کا کمرہ تھا۔ کس قدر سکون بخش! امریکہ کی بنی ہوئی مہاگنی کی قیمتی میز بیچ میں بچھی ہوئی تھی۔ جس پر سورج کی کرنیں کھیل رہی تھیں۔ مقابل کے بڑے مقعر آئینہ میں اس کا چمکدار عکس کتنا شاندار معلوم ہوتا تھا۔ سامنے ایک کونے میں چھوٹی سی خوبصورت میز پر شیشے کے دو چھوٹے چھوٹے لیمپ چمک رہے تھے۔

نیڈ ہر ایک چیز کو بہت پسند کرے گا۔ آتشدان کے سامنے وہ یکدار سیاہ رگ جس پر بہت خوشرنگ بیل بوٹے بنے ہوئے تھے اور چاروں طرف گہرے نیلے رنگ کی چوڑی چوڑی گوٹ لگ رہی تھی ایک عجیب شان دکھا رہا تھا۔ اس سے پہلے میں اس کی خوبصورتی کا پورا اندازہ نہ کر سکی تھی آتشدان میں جلنے کے لئے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پڑے تھے۔ آہ! اس کے بھڑکتے ہوئے سنہری شعلوں کے آگے کیسی کیسی خوشگوار راتیں گزر جائیں گی۔ نیڈ اور میری یہاں بیٹھینگے یہاں وہ اپنی محبت کے جذبات میں کھو جایا کریں گے۔

اس خیال نے بے چین کر دیا۔ دل دھڑکنے لگا میں نے ہر چیز پر ایک حسرت آمیز الوداعی نظر ڈالی اور کمرے سے نکل کر تیزی سے زینے پر چڑھ گئی۔ اوپر پہنچی۔ کچھ عجیب اثر محسوس ہوتا تھا۔ تمام مکان ایک نامعلوم کیفیت میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر چیز مسکرا رہی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مجھ پر طعنہ زنی کر رہی ہیں، میرے حال پر ہنس رہی ہیں۔۔۔ ایک مضحکہ آمیز ہنسی! مگر اس کا مطلب میرے فہم و ادراک سے باہر تھا۔۔۔ یہ مکان پھر آباد ہو گا۔ امیدیں پوری ہوں گی لیکن میں؟ میں کہاں جاؤں؟ میرا کون ہے؟ دنیا میں مجھے امید ہی کیا ہے! اب ایک کام باقی تھا اوپر آتے وقت میں نے دیکھا تھا کہ ایک کھڑکی کا پردہ ہوا سے اُڑ گیا ہے۔ بس صرف اسے ٹھیک کرنا تھا اس کے بعد گھر کی آرائش مکمل ہو جائے گی۔۔۔۔ آہ، وہ لطفِ زندگی، وہ جذباتِ محبت۔۔۔ اگر میں چاہتی تو میں ہی مالک ہوتی۔۔۔۔

میری کے کمرے میں کھڑکی کے قریب میں ایک صوفے پر گر پڑی۔ دونوں ہاتھوں سے میں نے اپنا مُنہ چھپا لیا اور بے اختیار رونے لگی۔

بہت دیر کے بعد مجھے معلوم نہیں کتنی دیر بعد، کیونکہ میں روتے روتے سو گئی تھی، میں اٹھکر زینے کی طرف چلی۔ سیڑھیوں سے اُتر رہی تھی۔ ایک دم رُک گئی۔ آواز! یقیناً آواز آ رہی تھی۔ میں سنے کھڑی تھی۔۔۔۔ شام ہو چکی تھی شفق پھوٹ رہی تھی۔ بیٹھنے کے کمرے میں موم بتی کی ہلکی زرد روشنی کانپ رہی تھی۔

بہت آہستہ آہستہ میں نے چند سیڑھیاں طے کیں اور سانس روک کر ہمہ تن گوش کھڑی ہو گئی۔ پھر سکوت ٹوٹا۔ نیڈ کی آواز آئی "یہ میری! تمہارے ساتھ یہاں بیٹھکر مجھے کتنی خوشی حاصل ہو رہی ہے۔ اپنے مکان کے آتشدان کے سامنے

تمہارے ساتھ تنہا بیٹھنے کی مجھے کتنی تمنا تھی۔ ہمیشہ اسی کے خواب دیکھا کرتا تھا......۔ او ہو، میں شکر بھول ہی گیا ابھی لاتا ہوں۔

میں اپنی آنکھیں ملنے لگی۔ کیا میں خواب دیکھ رہی تھی؟ لیکن کرسی کے سرکنے کی آواز میرے کانوں میں آئی اور پھر کسی کے فرش پر چلنے کی آہٹ معلوم ہوئی۔ میں بیدار تھی۔ نیڈ اور میری آگئے تھے۔ مجھے اس خیال سے وحشت ہونے لگی۔ ایک نا خواندہ آدمی کی حیثیت سے یہاں موجود ہونا...... کتنا شرمناک ہوگا۔

پھر قدموں کی آواز آئی۔ میں اپنی حالت بیان نہیں کر سکتی۔ دیوار کا سہارا لے کر کانپتی ہوئی آگے بڑھی۔ پھر نیڈ کی آواز آنے لگی۔

"میری، تم شاید ایک چمچہ شکر ڈالتی ہو...... تمہاری خدمت اور حفاظت کرنے میں کتنی مسرت ہوتی ہے"۔

پھر محبت میں ڈوبی ہوئی آواز میں اس نے کہا "اس سفر سے تم کافی تھک گئی ہوگی۔ پاندان پر اپنے پاؤں پھیلا کر آرام سے بیٹھو اور چا پی لو...... دل چاہتا ہے کہ تم ہر وقت میرے سامنے بیٹھی رہو۔ میری بکیا تمہیں بھی مجھ سے اتنی ہی محبت ہے"؟

میں کھڑی کھڑی کانپنے لگی، آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور پھر زینے کی طرف چلی تاکہ اوپر جا کر مکان کے پچھلے زینے سے اتروں اور باورچی خانے کے راستے سے باہر نکل جاؤں۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ جیسے کوئی گلا دبائے دیتا ہو۔

راستہ ٹٹولتی ہوئی باورچی خانے کے دروازے تک پہنچی میرا دل بیٹھا جاتا تھا۔ سامنے کے چھوٹے دروازے سے مجھے نکلنا تھا...... کیا میں کبھی باہر نکل سکوں گی؟ میں زیادہ انتظار نہ کر سکی۔ مجھے جلدی چلا جانا چاہیئے تھا۔ بہت جلدی...... میں آہستہ آہستہ سر جھکائے کسی خیال میں جا رہی تھی۔ بیٹھنے کے کمرے میں بالکل خاموشی تھی نیڈ شاید پھر موتی خانے میں گیا ہوگا۔ اب موقع ہے۔ میں دروازے سے چپکے سے نکل جاؤں۔ دیوار کا سہارا لے کر میں بہت احتیاط کے ساتھ قدم اٹھا رہی تھی۔ بیٹھنے کے کمرے کے سامنے آکر آگے کو جھکی تاکہ ایک مرتبہ اس لڑکی کی صورت دیکھ لوں جس کے لئے میں نے یہ مکان آراستہ کیا تھا، اور جو نیڈ کی شریکِ زندگی بن کر اسے آباد کرنے آئی ہے...... صرف ایک قدم۔ اس کے بعد میں دیکھ سکتی تھی۔

آتشدان میں جلتی ہوئی آگ کے سرخ چمکدار شعلوں سے میری آنکھیں چندھیانے لگیں۔ میں اور آگے کو جھکی۔ تاکہ اطمینان سے اچھی طرح دیکھ سکوں۔

مجھے سخت تعجب ہوا کرسی خالی پڑی تھی۔ میں گھبرا گئی۔ پائیدان پر بھی کسی کے پاؤں نظر نہ آئے۔ چائے کے برتنوں کی کشتی ریشمی خوان پوش سے ڈھکی ہوئی اب بھی ویسے ہی رکھی تھی جیسے میں رکھ آئی تھی۔ قریب ہی ایک چھوٹی سی میز پر شمعدان رکھا تھا۔ شمع جل رہی تھی میز کے دوسرے سرے پر کسی کا سر جھکا ہوا تھا...... یہ نیڈ کا سیاہ خوبصورت سر تھا۔ جسے وہ اپنے بازوؤں میں چھپائے ہوئے تھا.. کیوں..... یہ تو خوشی کا موقع تھا.....وہ اس قدر مایوس اور دل شکستہ کیوں ہے ؟! ......

میں ابھی تک کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔ لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا۔ پھر ایک دم بجلی کی طرح ایک خیال آیا اور میرا تمام جسم لرز گیا۔

"آہ... ! عورتوں کی غیر مستقل مزاجی !"

کیا میں نیڈ سے ہمدردی کروں ؟ کہیں اس سے اُس کے غم میں اضافہ تو نہ ہوگا ؟ میرا اس وقت جانا اُسکو ناگوار تو نہ ہوگا ! ایسے وقت لوگ اکثر تنہائی پسند کرتے ہیں۔

"نیڈ" سانس کے ساتھ ہی میرے ہونٹوں سے نکل گیا۔ لیکن اُس نے سنا نہیں۔ میں اب بھی جا سکتی ہوں، اور یہی بہتر بھی ہوگا۔

چند قدم کے فاصلے پر چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا، لیکن میں اس تک پہنچ نہ سکی۔ خدا معلوم کیوں میرے قدم ہی نہ اُٹھے.. کچھ دیر خاموش کھڑی رہی اور پھر ایک دم بیٹھنے کے کمرے میں داخل ہوئی۔ میرے تیز قدموں کی آہٹ بھی اُسے بیدار نہ کر سکی۔ اُس نے جنبش تک نہ کی۔

میز کے آگے کھڑے ہو کر میں نے پھر آہستہ سے کہا "نیڈ"

نیڈ نے گھبرا کر گردن اُٹھائی۔ اسکا غمزدہ اترا ہوا چہرہ دیکھکر دل بے قرار ہو گیا۔ میں نے کہا "مجھے بہت افسوس ہے ...." میری آواز کانپنے لگی۔

"کوئی ہرج نہیں" اُس نے ایک غم آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "بیٹھ جاؤ، تھوڑی سی چائے پی لو ..... ارے میں بھولا چائے کہاں ہوگی ؟!"

میں صوفے پر بیٹھ گئی اور وہ کہنے لگا "ایک چھوٹا سا خوبصورت اور دل خوش کن منظر میرے پیش نظر تھا۔ میں کتنا بیوقوف ہوں۔ لیکن کیا کروں میں تصور میں تمہیں اپنے ہمراہ پاتا تھا .... یہاں ..... اپنے اس مکان میں ...... اور اکثر ....."

میں شمع کی روشنی میں آگے کو جھکی کہ شاید اُسے پہچاننے میں غلطی ہوئی ہو۔

"لیکن نیڈ، یہ میں ہوں، نینی"

"ہاں - میں جانتا ہوں تم ہو۔"

پھر میں نے کہا "تم سے شاید تمہارا مطلب میری ہے"

"نہیں تم نینی ... میری کون - میری نہ کبھی کوئی ہوئی اور نہ ہو - ہمیشہ تم ہی تم تھیں"

میرے دل کی دھڑکن بند ہوگئی - اُس نے کہا میرا خیال تھا کہ میری تمام کوششوں کے مقابلے میں شاید یہی سب سے زیادہ باا ثر ہوگی ... گھر کی کشش - اور تم ایک جذبۂ بے اختیار سے مجبور ہوکر ہمیشہ کے لئے میری ہو جاؤ گی لیکن روانہ ہوتے وقت تم نے جس بے تعلقی کا اظہار کیا اور جس بے پروائی سے مجھے الوداع کہا اُس نے میری یہ آخری امید بھی توڑ دی"

میرا دل بے قابو ہوگیا جذبات کی ایک لطیف مگر ناقابلِ بیان کیفیت سے متاثر ہو کر میں نے شرم سے گردن جھکالی ... نیڈ تمہیں غلط فہمی ہوئی میں اُس وقت انتہائی ضبط سے کام لے رہی تھی"

اُس نے حیرت سے میری طرف دیکھا، اور دونوں کی زبانیں بند ہوگئیں۔

"نیڈ" اتنا کہہ کر میں جھجک گئی - لیکن جانے اس کی آنکھوں میں کیا تھا کہ میں بے اختیار کہہ اُٹھی "کیا اب تمہیں مجھ سے ... محبت ......"

اُس نے ایک قدم بڑھایا، میرے ہاتھوں کو جنبش ہوئی، اور اُس کا سر میری آغوش میں تھا۔

ناظم میرٹھی

عورت کی روح میں محبت کا ایک ایسا گہرا چشمہ ہے جسے کوئی سرمایہ بستہ نہیں کر سکتی۔

محبت اپنی راہ آپ نکال لیتی ہے۔

محبت عورت کی نیکی ہے۔

گلچیں

کہاں اب وہ مِرا بچپن؟

کہاں اب وہ مرا بچپن
وہ دل کے حُسن کا گلشن   وہ حق کے نور کا مسکن

مرا بچپن   مرا بچپن!
وہ اُس کی راحتوں کے دن   وہ اُس کی چاہتوں کے دن

جو سچ پوچھو تو سچ یہ ہے
گئے اور پھر نہ آئیں گے   گئے اور پھر نہ آئیں گے

خوشی سے یوں تو میں خوش ہوں   ذرا سوچوں تو میں خوش ہوں
میسّر ہے مجھے سب کچھ   مجھے درکار ہے کب کچھ
جوانی کی ہیں راتیں بھی   مسرت کی ہیں گھاتیں بھی
کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے   کمی کیا ہے سبھی کچھ ہے
مگر وہ راحتوں کے دن   مگر وہ چاہتوں کے دن

جو سچ پوچھو تو سچ یہ ہے
گئے اور پھر نہ آئیں گے   مجھے برسوں رُلائیں گے

ب ا

بہار کا آخری پھول

بہار کا آخری پھول زرد زرد پتّوں کے درمیان کھلا ہوا ہے ۔
اس کے ساتھ والے موت کی گہری نیند سو چکے ہیں ۔
نہ تو اُس کا کوئی ہم جنس پھول باقی ہے اور نہ کلی ۔
کوئی نہیں جو اس تنہائی کی حالت میں اس کا مونس و غمخوار ہو ۔
اے تنہا پھول! میں تجھے جُدائی کے رنج میں آہستہ آہستہ کملانے کے لئے نہیں چھوڑ سکتا ۔
تیرے رفیق فنا کی آغوش میں سو چکے ہیں تُو بھی اُن کے پہلو میں سو جا ۔
میں تیری پتّیاں ایک ایک کر کے فرشِ خاک پر بکھیر دیتا ہوں ۔
جہاں تیرے ہم جنس بے رنگ و بو، مٹی میں مل چکے ہیں ۔
اے کاش! اتنی ہی سرعت کے ساتھ میں بھی اِس سرزمین سے گذر جاؤں ۔
جب باہمی الفت فنا میں تبدیل ہو جائے ۔
جب محبت کے جگمگاتے ہوئے ہار سے موتی نکل نکل کر گر جائیں ۔
جب سچّی محبت کرنے والے دل خاموش ہو چکیں ۔
اور وہ جو دل کو محبوب ہوں ہمیشہ کے لئے جُدا ہو جائیں ۔
آہ کون ہے؟ جو اس طرح اس تیرہ و تار دنیا میں باقی رہنے کی خواہش کر سکے ۔

(ترجمہ)

ع

دھبّا

(ایک نفسیاتی مثال)

تاج محل ہوٹل کی رات روشنی سے دلہن بنی ہوئی تھی۔ ہر گوشہ ایک نشاط آفریں شور سے معمور تھا کسی میز پر لوگ تاش کھیل رہے تھے اور کہیں جوئے کی ہلاکت انگیز محویت طاری تھی۔ ہوٹل کی بیرونی فضا باوجود بجلی کی منتشر روشنی کے دھوئیں کی وجہ سے تاریک تھی۔

فیروز نے جیب سے ایک وزنی بٹوا نکالا اور دو اشرفیاں شراب کے پیالے میں ڈال دیں۔ وہ بے انتہا غریب تھا، لیکن اس وقت دفعتہً مالدار ہوگیا تھا۔ اُس کا دل جوشِ مسرت سے پھٹا جاتا تھا۔

ہوٹل کا دروازہ کھلا اور دو پولیس آفیسر اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک دروازے کے قریب ٹھیر گیا، اور دوسرا کچھ دور چل کر بجلی کے کھمبے کے نیچے کھڑا ہوگیا۔ جہاں سے اس نے عشرت کے اُن متوالوں پر ایک تیز نظر ڈالی جو مختلف دلچسپیوں میں محو تھے۔

فیروز نے اپنی پھیلی ہوئی ناک کو کسی قدر سکوڑا۔ اس وقت تک اُس کی بے رونق زرد آنکھیں ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی طرح اپنے حلقے میں گردش کر رہی تھیں۔ وہ معمولی شراب کا ایک گلاس پی کر پہلے تو کچھ کھانسا اور اس کے بعد جلدی سے تن کر کھڑا ہوگیا۔ وہ جانتا تھا کہ یقیناً اب وہ مر چکا ہے۔ اگر وہ اپنا راز خود نہ افشا کرے تو یہ ہمیشہ دنیا کے لئے ایک راز ہے۔

جب کہ ہوٹل والوں کی سینکڑوں نظریں فیروز کے اُڑے ہوئے چہرے پر لگی ہوئی تھیں، پولیس آفیسر نے ذرا صاف لہجے میں دوسرے سپاہی کو مخاطب کر کے کہا

"آج بمبئی سے ایک میل کے فاصلے پر ایک شخص بُری طرح لُوٹا اور قتل کیا گیا۔"

یہ سن کر فیروز کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی صورت سے وہ یہاں سے نکل جائے، لیکن پولیس آفیسر کی نظریں ہوٹل کے تمام کمروں کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ اس نے خیال کیا کہ جس طرح اور لوگ اپنے کاموں میں مصروف ہیں، میں بھی انہیں میں مل کر پولیس کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں۔ اس خیال کے آتے ہی وہ آہستہ آہستہ

اپنی جگہ سے اُس میز کی طرف چلا جہاں کثرت سے لوگ بیٹھے ہوئے پولیس کی اس نقل و حرکت کو دیکھ رہے تھے ۔ ان لوگوں کے چہرے بجلی کی روشنی میں چمک رہے تھے اور پولیس آفیسر ذرا ہٹا ہٹا کھمبے کے قریب روشنی کے سائے میں کھڑا تھا، جہاں سے وہ ہر شخص کے چہرے کو آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔

فیروز کے چہرے پر مصنوعی ہنسی کے آثار اب تک موجود تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اُس کے چہرے کی بشاشت قائم رہے، لیکن اندر سے جبڑے بند ہوئے جاتے تھے ۔ پولیس آفیسر نے پھر کانسٹبل کو مخاطب کرتے ہوئے تیز آواز میں کہا۔

" جس وقت ہم نے اس کو پایا وہ قطعی طور پر مرا نہیں تھا "

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا، لیکن فیروز کی یہی خواہش تھی کہ وہ ابھی کچھ اور کہے ۔ کچھ وقفہ اسی طرح خاموشی میں گزر گیا ۔

پولیس آفیسر نے پھر کہا

" مرنے سے پہلے اُس نے چند الفاظ کہے تھے "

اِس جملے سے مجمع پر ایک سناٹا چھا گیا، فیروز کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کا گلا گھٹا جا رہا ہے، پسینے کے قطرے اس کی پیشانی پر چمک رہے تھے ۔

پولیس آفیسر نے مجمع پر ایک نظر ڈالی اور ہر شخص کے چہرے کو غور سے دیکھ کر بولا

" اُس پر پیچھے سے بندوق چلائی گئی، اور وہ مُردوں کی طرح زمین پر گر پڑا تاکہ اُس میں زندگی کا شبہ نہ کیا جا سکے ۔ جب قاتل نے اُسے لوٹنے کے لئے سیدھا کیا تو اس نے اُسے دیکھ لیا "

فیروز نے چپکے سے اپنے کاندھوں کی طرف دیکھا ۔ دونوں طرف لوگ کثرت سے کھڑے ہوئے تھے۔ ابھی وہ یہ دیکھ ہی رہا تھا کہ دو آدمی اس کی پیچھے کی کرسیوں پر کھڑے ہو گئے تاکہ وہ پولیس آفیسر کو اچھی طرح دیکھ سکیں۔

اب فیروز کی پریشانی کی کوئی انتہا نہ تھی ۔ اس کا شبہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جاتا تھا ۔

" روشنی زیادہ تیز نہ تھی تاہم ایک بات اچھی طرح واضح ہوگئی "

پولیس آفیسر نے یہ جملہ ذرا ٹھہر ٹھہر کر کہا جس کا ہر ہر لفظ دل میں گڑا جاتا تھا

" اُس نے مجھ سے کہا اور شاید یہ اُس کے آخری الفاظ تھے "

فیروز کی نظریں متوحش ہوگئیں، اُس کی ہر حرکت سے اضطراب پیدا تھا، وہ ہر شخص کے چہرے کو ایک پریشانی کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔

"اُس نے کہا قاتل کے چہرے پہ ایک بہت نمایاں دھبا ہے اور اسی سے اُس کا پتہ لگایا جاسکتا ہے"

یہ سنتے ہی فیروز کا ہاتھ بے اختیار اپنے رخساروں کی طرف بڑھ گیا۔ پولیس آفیسر یہ دیکھتے ہی فیروز پر شیر کی طرح جھپٹ پڑا اور کانسٹبل نے جو قریب ہی کھڑا تھا اُس کے ہاتھوں میں ہتکڑیاں ڈال دیں۔

تلاشی کے بعد فیروز کی جیب سے مقتول کی ایک ایسی گھڑی نکلی جس پر اُس کا نام کھدا ہوا تھا۔ دوسرے دن کانسٹبل نے آفیسر سے حیرت کے ساتھ پوچھا کہ جب ہم لوگ جائے وقوع پر پہنچے تھے تو مقتول مرچکا تھا۔ اُس نے تو ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہیں کہا، پھر آپ نے دھبے کے متعلق کیونکر کہا۔ پولیس آفیسر مسکایا اور اُس نے کہا کہ یہ علمِ نفسیات کے معمولی کرشمے ہیں۔

سید ابو محمد ثاقب کانپوری

دل!

دل کے اندر دو خوابگاہیں ہیں!
ایک میں خوشی رہتی ہے اور دوسری میں غم!!

خوشی — اپنی خوابگاہ میں جاگ رہی ہے!
غم — اپنی خوابگاہ میں نہایت سکون کے ساتھ سو رہا ہے!!

اے خوشی تیرے تلاطم خیز، ہنگامہ پرور نغمے تجھے سلامت!!
مگر آہ دیکھ ذرا دھیمی آواز سے الاپ،
ایسا نہ ہو کہ غم کا پُرسکون خواب پریشان ہو جائے!!!

(جرمن)

عظیم قریشی لدھیانوی

تجلّیات

چھٹا ہوں جب سے اُس آرامِ جاں سے ہمیشہ کام ہے آہ و فغاں سے

تصوّر کے لیے لائی ہے جلوے نگاہِ شوق حُسنِ دلستاں سے

فسانہ قیس کی دیوانگی کا ہے اِک ٹکڑا ہماری داستاں سے

خلوصِ عشق کو شکوے بہت ہیں تمہارے التفاتِ بدگماں سے

مرا پھر امتحاں مدِ نظر ہے کہ رہتے ہیں وہ اکثر سرگراں سے

ہوائے شوق اُڑائے جا رہی ہے بڑھا جاتا ہوں آگے کارواں سے

تمہاری ہمدمی کا ایک لمحہ کہیں بہتر ہے عمرِ جاوداں سے

ہماری تشنگی کیا بجھ سکے گی عطائے ساقیِ اندازہ داں سے

مہک اُٹھی ہے دنیائے تمنا تمہارے گیسوئے عنبر فشاں سے

انہیں دردِ محبت کا فسانہ سنا دوں کا نگاہِ بے زباں سے

پناہیں ڈھونڈتا پھرتا ہے طوفاں ہماری کشتیِ بے بادباں سے

کوئی کاش اتفاقِ آسمانی

ملا دے سرورِ عرش آستاں سے

سروری

معلوم نہیں میرا بیاہ کس ساعت میں ہوا کہ عیش و آرام میں رہنے پر بھی میرے دل کا اطمینان جاتا رہا۔

میرے پتا بہرام پور کے ڈسٹرکٹ انجینئر تھے۔ میں ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ گھر میں دولت کی کوئی کمی نہ تھی، اس وجہ سے میرے والد کو میری شادی کی طرف سے اطمینان تھا۔ میری ماں نے پہلے ہی سے اپنی ایک سہیلی کے لڑکے کے ساتھ میرا بیاہ کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ وہ لڑکا تھا تو امیر گھرانے کا لیکن دولتِ علم سے محروم تھا، اس لئے میرے پتا کو میری ماں کا انتخاب پسند نہ تھا اور وہ میرے لئے کسی اَور لڑکے کی تلاش میں لگے جو امیر ہونے کے ساتھ ہی دولتِ علم سے بھی مالا مال ہو۔ حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت میں بھی اچھا ہو۔ یہ صفتیں ایک ہی جگہ مشکل سے ملتی ہیں۔ جو خوبصورت ہوتے ہیں وہ عقلمند نہیں ہوتے جو عقلمند ہوتے ہیں وہ دولتمند نہیں ہوتے۔ امیر بھی ہوئے تو علم نہیں رکھتے۔ غرضکہ حُسن، دولت اور علم والے شوہر مشکل سے ملتے ہیں۔

تلاش ہوتی رہی یہاں تک کہ میں نے آہستہ آہستہ تیرھویں سال میں قدم رکھا۔ جوانی نے بالے پن کی بانہہ پکڑی اب پتاجی کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔

ایک دن جب میں کسی کام سے پتاجی کے کمرے کی طرف گئی تو ماتاجی کو پتاجی سے باتیں کرتے سنا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی کیونکہ وہ اکثر گھر گرہستی کے متعلق بات چیت کیا کرتے تھے۔ لیکن جب ان کی گفتگو میں میں نے اپنا نام سنا تو میری دلی خواہش ہوئی کہ میں چھپ کر اُن کی باتیں سنوں۔ میرے اس وقت کے جذبات کا میری ہم عمر لڑکیاں بخوبی اندازہ کر سکتی ہیں۔ چنانچہ میں دروازے کے پاس چھپ کر اُن کی باتیں سننے لگی۔ ماں نے کہا۔

"تمہارے حسبِ منشا لڑکا تو ملا نہیں ایسی حالت میں تو یہی بہتر ہوگا کہ تم اب میری بات مان لو اور لڑکی کا بیاہ گووندلال ہی کے ساتھ کر دو۔ دیکھنے میں لڑکا بُرا نہیں ہے۔ اس نے کوئی امتحان نہیں پاس کیا ہے لیکن اس سے ہوتا ہی کیا ہے نہ معلوم کتنے بی اے۔ ایم اے جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں لیکن کہیں جگہ نہیں ملتی۔ گووندلال کے یہاں دولت کی کمی نہیں۔ ڈگری کی اُسے کیا پرواہ۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اب تک تو اُسے تم سے کہیں زیادہ رئیس کے یہاں کی لڑکی مل جاتی۔"

پتاجی بولے ــ "تم اِن باتوں کو نہیں سمجھ سکتی ہو۔ دولت کا کوئی اعتبار نہیں۔ وہ ہمیشہ ایک ہی جگہ نہیں ٹھیرتی۔
میری تو خواہش ہے کہ لڑکا تعلیم یافتہ ہو اور اپنے ہی ہاتھوں کی کمائی کھاتا ہو۔ ماں باپ کا محتاج نہ ہو۔ مجھے
پانچ مہینے کی رخصت مل گئی ہے۔ اب میں کلکتہ جاؤں گا اور وہاں کوئی لائق لڑکا تلاش کرکے پھر کوئی فیصلہ کروں گا"
ماں بولی ــ "لڑکی سیانی ہوگئی ہے خواہ مخواہ کی دیر کر رہے ہو۔ اگر کوئی لڑکا ملنا ہوتا تو کبھی کا مل جاتا میرے خیال میں
تو گووند سے بڑھ کر داماد مل نہیں سکتا"
میں نہیں کہہ سکتی کہ پتاجی کیا سوچنے لگے ہیں بھی پھر یہ سننے کے لئے کہ اب آگے کیا باتیں ہونگی وہاں نہ ٹھیری
جو کچھ معلوم کرنا تھا معلوم کرچکی تھی اب ٹھیرنا بیکار تھا۔
اِس کے ایک ہفتہ کے بعد ہم سب کلکتہ پہنچ گئے۔

(۲)

دیکھتے ہی دیکھتے کلکتہ میں تین مہینے گزر گئے۔ میرا جی وہاں نہ لگا۔ صبح اُٹھتے ہی میں اوپر چھت پر جاکر بیٹھ
جاتی تھی۔ مگر سورج کی من موہنی کرنیں اور افق سے طلوع ہونے کا نظارہ کلکتہ ایسے گنجان شہر میں کہاں نصیب ہے یہاں
لہلہاتے ہوئے سرسبز پودوں کی ہریالی آنکھوں کو طراوت نہیں پہنچاتی تھی۔ آم کے بور کی میٹھی خوشبو پاگل نہیں
بناتی تھی۔ اور بسنت کا "پاپی پپیہا" پی کہاں کی رٹ سے دلوں پر چوٹ نہیں لگاتا تھا۔
ایک دن میں چھت پر بیٹھی تھی ماں نے آکر کہا۔ بیٹی! ذرا نیچے چل! اِن کپڑوں کو اُتار کر اچھے کپڑے پہن
لے۔ آج تجھکو دیکھنے والے آئیں گے کلکتہ میں یہی رسم ہے کہ شادی سے پہلے لڑکی کو دیکھ لیتے ہیں۔ دو لہا خود
دیکھنے آئے گا کلکتہ کا لڑکا جو ٹھیرا ــــــ"
میں پانی پانی ہوگئی۔ اب تک تو پتاجی ہی بر کو تلاش کر رہے تھے، مجھے دیکھنے کو کوئی بھی نہیں آیا تھا۔
مدت کے بعد شاید پتاجی کو کوئی بر پسند آیا اور وہی آج مجھے دیکھنے آنے والا تھا۔ ایک تو دیکھنا اور پھر بر کا خود ہی دیکھنے
کے لئے آنا ــــــ آہ کیسی شرم کی بات ہے۔ مجھے تو یہ سوچتے ہی لاج آنے لگی۔

(۳)

امتحان کا وقت قریب آگیا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس پہلی ہی آزمائش میں میری زندگی کی جیت ہوگی یا ہار۔ میرے
خواب وخیال میں بھی یہ بات کبھی نہ آئی تھی کہ میرا حسن وجمال کسی "دیوتا کے چرنوں میں بیکار ہی نذر ہو جائے گا۔ ہائے
میں نے جان کیوں نہیں لیا! آہ میری پھوٹے مُنہ سے کچھ کہا کیوں نہیں گیا اور اگر مجھ سے کہا نہیں گیا تو میں مر کیوں نہیں گئی"!

صبح آٹھ بجے میرے پتاجی کا چہیتا (شاید پورا چہیتا نہیں تھا) اپنے ہمجولیوں کے ساتھ مجھے دیکھنے آیا۔ گو میری ماں کی یہی خواہش تھی کہ میرا بیاہ گووندلال ہی کے ساتھ ہو پھر بھی انھوں نے مجھے سجانے میں کوئی کسر نہیں رکھی۔

مجھے ایسا معلوم ہوا گویا میری ماں چپکے چپکے کہہ رہی ہے "یہ روپ دیکھ کر کون نہ پسند کرے گا"

میری ذات کا ایک بھائی مجھ کو دیکھنے کے لئے آگیا۔ میں سب کو پرنام کر کے لجاتی ہوئی بیٹھ گئی۔ کل تین آدمی مجھے دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ دو معمولی شکل وصورت کے تھے یہی دو مجھ سے سوالات کرتے رہے۔ تیسرا آدمی آہ کیا بتاؤں اور کس زبان سے کہوں ـــــ بڑا سندر تھا۔ شرم سے اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا اور وہ چپ چاپ نظر نیچی کئے بیٹھا تھا۔

اُن میں سے ایک نے میرا نام پوچھا اور دوسرے نے دریافت کیا "کیا پڑھتی ہو؟" میں نے اپنا نام تو بتا دیا لیکن جو پڑھتی تھی وہ نہ بتایا۔ میرے ایک رشتے کے بھائی نے کہہ دیا کہ "بہرام پور کے گرلس سکول سے اس نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا ہے۔"

نہ جانے انھوں نے مجھ سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ ایک بار ذرا میری طرف دیکھا۔ آنکھیں چار ہوئیں۔ میرا دل مچل گیا۔ کتنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں تھیں ـــــ اُف میں تو لُٹ گئی۔ اُن رسیلے نینوں نے میرا دل موہ لیا۔ میں تو اُن آنکھوں کو دیکھتے ہی پاگل ہو گئی۔

ان دونوں آدمیوں میں سے ایک نے اُن سے کہا "ششو! تم بولتے کیوں نہیں ہو؟" انھوں نے یہ کہہ کر کہ "تمہاری باتیں سن تو رہا ہوں" میری طرف دیکھا۔ نہیں کہہ سکتی کہ مجھ کو کیوں دیکھا۔ لیکن پھر مجھ سے اُن کی طرف نہیں دیکھا گیا۔

اِس کے بعد میں وہاں سے اُٹھ کر چلی آئی۔ قدم مشکل سے اُٹھتے تھے۔ ایک مرتبہ گھوم کر اُن کی طرف پھر دیکھ لیا۔ چاروں آنکھیں ملیں۔ میں تیزی سے پاؤں اُٹھاتی ہوئی بھاگ کھڑی ہوئی۔

(۴)

آہ! میں اپنے دیوتا کی پوجا نہ کر پائی۔ میرا دیوتا عقلمند تعلیم یافتہ ہوتے پر بھی چنچل لکشمی دیوی کا منظورِ نظر نہ تھا اِس لئے بہت کہنے سننے کے بعد بھی میری ماں ہی کی جیت ہوئی۔ لکشمی کے پیارے گووندلال ہی کے ساتھ میرا بیاہ ہو گیا۔ اُس وقت میری عمر چودہ برس کی تھی۔

پیاری ماں! تو نے مجھے کیوں تعلیم یافتہ بنایا۔ جاہل رکھ کر شروع ہی میں گووندالال سے کیوں نہ بیاہ دیا۔ اور اگر ان کے ساتھ ہی بیاہ دینا منظور تھا تو پھر خواہ مخواہ میری آنکھوں کو کسی موہنی صورت والے کا جلوہ کیوں دکھایا تھا۔

آہ! میں بڑی کشمکش میں مبتلا ہوں میرے سوامی مجھے دل وجان سے پیار کرتے ہیں اُن کو مجھے دھوکا دینا پڑتا ہے جن کی مہربانی سے میں آج خادموں اور کنیزوں سے گھری ہوئی ہوں، ہیرے اور جواہرات کے زیوروں سے سجی ہوئی ہوں، انہیں کو دھوکا دینا! ——— تف ہے اس زندگی پر!

میرے سوامی ایک دن بہت سے پھولوں کے گجرے لے آئے۔ میں پھولوں کی عاشق ہوں، انہوں نے میرے گلے میں ہار ڈال کر کہا۔ "ہر ولیشوری! میں تجھ سے جتنا پریم کرتا ہوں تو مجھ سے اتنا نہیں کرتی"۔ یہ سنتے ہی میرا منہ فق ہو گیا میرا دل کانپ اُٹھا۔ میں نے کہا ——— "پریتم! سوامی کو چھوڑ کر عورت کے لئے اور کون چیز محبت کے لائق ہو سکتی ہے۔ اس دنیا میں تو شوہر ہی عورت کا سب کچھ ہے"۔

اُف! یہ تو دھوکا ہے۔ میں تو دل کھول کر بھی نہیں کہہ سکتی کہ "آپ ہی میرے سب کچھ ہیں اور آپ ہی میرے دین و دنیا ہیں"۔ پھر بھی اُن کو یقین آ گیا کہ میرے سب کچھ وہی ہیں۔ اے دائمی نیند لانے والی موت! کیا تو اس رسم ورواج کے جال سے، اس قیدِ ہستی سے مجھے کبھی نجات نہ دے گی۔ کیا مجھ کو اطمینانِ قلب کبھی نہ حاصل ہو گا!

میرے سوامی نے جوش محبت سے مجھے اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ میں اپنے آنسوؤں کی جھڑی کو نہ روک سکی۔ ایسے پاک باطن اور نیک دل سوامی کو پا کر بھی میں خوش نہ رہ سکی۔ ہائے میں نے کس منحوس ساعت میں اپنے دیوتا کو دیکھا تھا۔ اگر میں اُن کو نہ دیکھتی تو آج میری زندگی کتنے آرام اور خوشی سے بسر ہوتی۔

کچھ عرصے کے بعد جب میں نے اپنے ایک رشتہ دار سے سُنا کہ "ششو" نے عہد کر لیا ہے کہ اب وہ جیتے جی بیاہ نہ کرے گا تو میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔ میں کئی دن تک برابر چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی پھر بھی میرے دل کی آگ نہ بجھی اور نہ اب امید ہے کہ اس زندگی میں بجھے گی۔ ہائے

آہ کروں تو جگ جرے اور جنگل ہوں جر جائے

پاپی جیرا نہ جرے جہ ماں آہ سمائے

(میری آہ سے ساری دنیا جلنے لگتی ہے جنگل میں آگ لگ جاتی ہے لیکن ہائے یہ کمبخت دل ہی نہیں جلتا جس میں آہ سمائی ہوئی ہے۔ اے کاش یہ آہ میرے جسم کو جلا کر خاک کر دیتی)

(ماخوذ از بنگالی)

اعظم کریوی

نوائے مضطر

مژدہ اے خاطرِ مایوس کہ تو آر آیا
مژدہ اے شوق کہ اب وعدۂ دیدار آیا

دیکھئے وصل و ملاقات میں کیونکر گزرے
عشق میں مرحلہ یہ اور بھی دشوار آیا

جگمگا اٹھی ہیں جلووں سے فضائیں کیا کیا
محفلِ ناز میں وہ پیکرِ انوار آیا

نگہِ ناز نہیں شرم و حیا سے اٹھتی
آج محفل میں کوئی محرمِ اسرار آیا

وفا ہے اب نہ کچھ قدرِ وفا ہے
الٰہی آگیا کیسا زمانہ

کہاں آوارگانِ شوق جائیں
ترے در کے سوا اُن کا ٹھکانا؟

ہمیں محفل سے اُٹھوانے کا آخر
انہیں ملتا بھی ہو کوئی بہانہ

میں کب آتا تھا یوں قیدِ قفس میں
مجھے لے آیا میرا آب و دانہ

ترے دیدار سے حیراں نگاہیں
ترے جلووں سے دل آئینہ خانہ

بہت اچھی گزر جائے گی مضطر
مے و مطرب سے رکھو دوستانہ

رام رتن مضطر

محفلِ ادب

اجنتے کا پرستان

اجنتے کی تصویریں کیا ہیں نقش ورنگ کی پریاں ہیں۔ کوئی دو ہزار برس ہوئے۔ چند ہندی فن کاروں نے انہیں اُتارا تھا وہ دن اور آج کا دن کہ یہ دعوتِ ذوق سمجھی ہوئی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اب تو یہ پرستان پاؤ پاسنگ بھی نہیں۔ اتنے دنوں میں جانے کیا کیا مٹ گیا۔ پھر بھی جو کچھ رہ گیا ہے فن وکمال کا جوہر ہے۔ یوں ہر پیاری چیز سے سدا دل کی کلی کھلتی ہے، مگر اجنتے کی رنگین سج دھج دیکھنے سے تو آج بھی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے روح پر کسی نجان سورج کی کرنیں پڑتی ہوں۔ کہیں مور و مرغابیاں ہیں تو کہیں بیل بندر، ہرن اور ہاتھی ہیں۔ کہیں جھیل تالاب ہیں تو کہیں جنگل بیابان اور باغ وبہار ہے۔ جاتکاؤں میں مہاتما گوتم کی جنم کہانی سنائی ہے، دیومالا سے خدائی کوزے میں سمائی ہے، اچھا اتنا بڑا تو یہ کام ہے کہ دنیا اِسے سراہتی سر آنکھوں پر لیتی ہے۔ اور ہے بھی یہ کہ دنیا بھر میں یہی ایک مقام ہے جہاں عقل واعتقاد نے یوں کھل کر آرٹ کے گلے میں بتیاں ڈالی ہیں! مگر اصل پوچھو تو یہ سارے کا سارا دیئے کے کاجل اور لال پیلے گیرو کا کرشمہ ہے۔ سوائے کمال کے کوئی اور بڑھیا چیز تھی ہی نہیں جس سے وہ باکمال اپنی پریاں سجاتے۔ رنگوں کی یہ حقیقت تھی۔ بعد کی رام کہانی بھی سُن لو، یہ اُس سے عجیب سے عجیب حیرت سی حیرت ہے کہ ظالم تصویر کیا کھینچتے تھے فن وکمال کے شگوفے کھلاتے تھے۔ یعنی پہلے چکنی مٹی لی، اُس کا گارا کیا، گارے میں دھان کا بھوسا اور گوندملا پتھر پر لتھیڑ دیا۔ بعد میں چونے کا پچارا کیا۔ کرنی سے ہموار کیا اور اس پر یاداجی یا کالے رنگ میں تصویر کا چربہ اُتار کے رنگ بھر دیا۔ زیادہ تفصیل کھولنی ہوئی تو ذرا اور افشاں کردی چلیے چھٹی ہوئی۔ تصویر کھنچ گئی۔ یوں یہ تصویریں اتری ہیں۔ جن میں قیامت کی سج دھج اور دنیا کی صفائی ہے۔ پھر دیکھو تو کوئی چیز پرائی نہیں۔ سب اپنی ہیں۔ دیکھنا! کیسے بڑے بڑے ایوان ہیں، کس ٹھاٹھ کے ساز وسامان ہیں ہیچ وہ دیکھو ایک ایوان میں راجہ اور رانی بیٹھے ناچ دیکھ رہے ہیں۔ راجہ شاہی مسند پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے۔ سر پر جڑاؤ مکٹ، گلے میں بیجنتی مالا ہے۔ رانی بڑے انداز سے راجہ کے زانو پر سہارا دیئے بیٹھی ہے۔ داسیاں

کھڑی مورچھل کر رہی ہیں، پاس ہی ایک اور ذی عزت خاتون چٹاپٹی کی سوزنی پر بیٹھی ہے۔ ایوان کے بیچوں بیچ سجا سجایا مندوب ہے، جس کے فرش پر ارغوانی پھول بکھرے ہوئے ہیں۔ یہاں ایک کنیا سندر ناچ رہی ہے۔ یہ پرکالہ نور یں پورے آستینوں کی بڑی نفیس سیاہ جاکٹ پہنے ہوئے ہے، جس پر نقرئی گجائی کے پھول بوٹے بنے ہوئے ہیں آنکھوں میں کاجل، ہونٹوں پہ پان کا لاکھا، مستی کی دھڑی۔ عجیب دلفریبی کا عالم ہے۔ جاکٹ میں سے اس نازنین کا کندن سا جسم ایسا چمک رہا ہے، جیسے کسوٹی پر سونا! سنگت میں دو لڑکیاں سامنے کھڑی پریم کی بانسری بجا رہی ہیں۔ کچھ پیچھے ہیں ان میں کسی کے پاس مجیرے ہیں، کوئی طبلے، مردنگ اور ستار کے میٹھے بول نکال رہی ہے۔ دونا چنے والی برق بلا کے اہلو پہلو ہیں۔ یہ شاید تان پلٹ میں ساتھ دیں گی۔ اسی ایوان میں پرے گوشے پر ایک اور کامنی مورت کھڑی ناچ دیکھ رہی ہے۔ نازک نازک انگلیوں پر ٹھوڑی کو اس شان سے رکھ لیا ہے کہ یہاں رعائل بھی دیکھا کریں آگے بڑھو تو ایک طرف ایک سادھو جی آسن جمائے بیٹھے ہیں۔ سبز پیرہن ہے۔ سامنے ناگ مہاراج براجمان ہیں۔ سر پر بے بہا تاج، تاج کے ارد گرد دست ناگی ہالہ۔ پیچھے ایک شہزادی کھڑی باتیں سن رہی ہے۔ داسی چوری ہلا رہی ہے۔ دوسری طرف یہ منظر ہے کہ دریا میں ایک کشتی تیرتی چلی جاتی ہے، اس میں راجا جی اور چار مصاحب بیٹھے سیر کر رہے تھے کہ کشتی ڈوبنے لگی۔ اب کوئی کشتی کو بچانے کی دھن میں ہے کسی کے ہاتھ پیر پھول گئے، غریب کے ہوش فاختہ ہیں۔ کشتی سے لگی ایک بڑی ساری مچھلی نظر آتی ہے۔ اسی نے گویا کشتی پر حملہ کیا ہے۔ ایک وفادار جان پر کھیل کے ڈبتے راجہ کو نکال لایا ہے، صلہ میں انعام پا رہا ہے۔ ایک جگہ ایک سندری کی جان پر آ بنی ہے۔ راجہ تلوار سونتے کھڑا ہے، وہ قدموں میں پڑی ہے۔ یہ تصویر بھی بڑی شاہانہ ہے۔ اور چھپائے کی لائن کا تو وہ بھاؤ ہے کہ انگریس کا موقلم بھی مات ہے۔ لیکن ہائے! وہ حسن انفعال جو اس خوبصورت مجرم کی گردن اونچی نہیں ہونے دیتا!! سر جھکا ہوا ہے اور نازک ہاتھ اس طرح پھیلے ہوئے ہیں جیسے حسن و التجا کے دو چشمے رواں ہوں۔ مگر پھر بھی انہیں ہٹیلے قاتل کے پاؤں تک چھونے کا حوصلہ نہیں۔ عقوبت گناہ کا بڑا ہی خوبصورت نظارہ ہے، جس میں عبرت کے ساتھ ساتھ دلربائی بھی گھلی ملی ہے۔ یہاں حسن کہتے کو تو دم بھر میں مٹا چاہتا ہے۔ مگر دیکھنا جرم کو کس معصوم انداز سے چھپائے ہوئے ہے! سولھویں غار میں بھی ایک مرن ہار شہزادی کی دلگداز تصویر ہے۔ یہ ماندگی سے کملائے پھول کی طرح بے حال پڑی ہے۔ کچھ کنیزیں دیکھ بھال کر رہی ہیں۔ تصویر میں لائن کا وہ کھیل ہے کہ موت کی تلخی تک آگئی ہے۔ یہ شہزادی بھی ابجنتے کی دوسری سندریوں کی طرح نک سک سے درست ہے۔ لمبوتی آنکھیں، کتابی چہرہ چھوٹا سا دہانہ، بوٹا سا قد، پھول سے گال، سنبل سے بال، جو شانوں پر بکھرے ہوئے ہیں۔ چہرے پر ظلمن موت کھنڈ گئی

ہے۔ اور آثار ایسے ہوئے ہیں کہ دیکھنے والا اپنی آنکھوں ایک خوش اندام کو دم توڑتے دیکھتا ہے جو دنیا کی سب سے بڑی اور بُری تکلیف ہے! ایک جگہ ایک خوابگاہ ہے، جس میں برہ کی ماری شہزادی سُہاگ سیج پر لیٹی ہے۔ تکیہ پر سر ہے بایاں پیر بھی پہلو تکیہ پر ڈال لیا ہے، ہاتھوں میں شاہانہ مہندی، جسم پر زعفران اور ہلدی رچی ہے۔ اُبھرتا سینہ ہی جو ابھی تک خاص چیز ہے۔ بشرے سے عیش و مستی کے بجائے عصمت و جوانی برستی ہے۔ پور پور موتی ہیں۔ پیروں میں نفیس پازیب زیب دے رہے ہیں۔ دبلی ٹانگوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ پُرشباب ماندی ہے۔ ایک داسی سرہانے اور ایک پاؤں پر پانی ڈال رہی ہے۔ دروازے پر ایک خادم کاندھے پر سبوچہ لئے کھڑا ہے۔ ایک داسی کے ہاتھ میں چوری ہے۔ دوسری محبت بھری نظروں سے شہزادی کو دیکھ رہی ہے۔ چہرے سے فکرمند معلوم ہوتی ہے۔ شہزادی فراق کے صدمے سے گھل گھل کے اتنی نزار ہوگئی ہے کہ اُسے غش آگیا تھا۔ اب خدا خدا کرکے کہیں ہوش آیا ہے۔ مختصر یہ کہ کہیں یہ سندر سین ہیں، کہیں لنکا کی لڑائی ہو رہی ہے۔ ایک معرکہ کا رن پڑ رہا ہے۔ ہاتھی حملہ کو تلے کھڑے ہیں۔ تیر اڑ رہے ہیں، نیزے چمک رہے ہیں۔ کہیں شکار ہو رہا ہے۔ جنگل بیابان لق و دق میدان ہے، جانور پھڑک رہے ہیں، شکاری تعاقب کر رہے ہیں۔ کہیں یوگی ہیں۔ بیراگی بھیس کسی کے ہاتھ میں پھول ہیں، کوئی لٹیا لئے ہے، پوجا کرنے آتے ہیں۔ کہیں بیلا بٹ رہا ہے۔ کہیں بڑے ٹھاٹھ سے جلوس جا رہا ہے۔ شہزادیاں سونے میں پیلی موتیوں میں سفید جھروکوں سے بیٹھی بازار کی سیر دیکھ رہی ہیں۔ وہی غلافی آنکھیں، آنکھوں میں سرمے کی تحریر، ہاتھوں میں شاہانہ مہندی ہونٹوں پر پان کا خوبصورت لاکھا، مسی کی دھڑی! کوئی ہونٹوں پر انگلی رکھے ہے جو ہندی نسائیت کی جان ہے کہیں ہمسن ہمجولیاں، نوخیز انیلیاں بیٹھی ہنس بول رہی ہیں۔ کہیں جشن کی تیاریاں ہیں، اور کوئی دم جاتا ہے کہ تورے بندی ہوتی ہے، طبلے پر تھاپ پڑتی ہے، ٹھمک ٹھمک ناچ ہوتا ہے۔ کیوں کہ بی سرسوتی کا بیاہ رچا ہے۔

"ساقی"

زندگی کا وہ حیرت انگیز لمحہ

مجھے زندگی کا وہ حیرت انگیز لمحہ یاد ہے
جب تو میرے سامنے نمودار ہوئی
ایک دیدار کی طرح جو چشم زدن کے لئے عطا ہوا،

ایک حسن کا مجسمہ جو اپنی جھلک دکھا گیا۔
بہت دنوں تک جب کہ بے ثباتی دو اور دمجھے تڑپاتا
یا میں دنیا کے شور و غل اور لغویات سے پریشان ہوجاتا

تو تیری نرم آواز میرے کانوں میں گونجنے لگتی،
اور تیرا پیارا چہرہ مجھے خواب میں نظر آیا کرتا۔
زمانہ گزرتا گیا، جذبات کی باغیانہ شورشوں نے
پُرانے خواب منتشر کر دیئے؟
میں تیری نرم آواز بھول گیا
اور تیرا پیارا چہرہ۔
جلاوطنی کے گوشے، جُدائی کی تاریکی میں میری
عمر اپنی سست رفتار سے گزرتی رہی!
نہ کوئی ایسا تھا جس کی ناز برداری کروں یا جو
میرے جسم میں جان پھونکے،

نہ آنسو تھے، نہ زندگی، نہ محبت۔
میرے دن پھرے، میرا دل بیدار ہوا،
تو پھر میرے سامنے نمودار ہوئی،
ایک دیدار کی طرح جو چشم زدن کے لئے عطا ہوا،
ایک حسن کا مجسمہ جو اپنی جھلک دکھا گیا۔
میرا دل خوشی سے دھڑک رہا ہے۔
اسے ناز برداری کا فخر حاصل ہوا ہے،
اسے ایک ہستی ملی ہے جو اس میں دوبارہ جان پھونک سکتی ہے
اور اب اُسے پھر جینا نصیب ہوا ہے اور آنسو
بہانا اور محبت کرنا۔

"اردو"

پالکی والوں کا گیت

آہستہ آہستہ بہت سہج سہج ہم اُس پردہ نشین کو لے جا رہے ہیں۔ پالکی نشین ایسے ہچکولے کھا رہی ہے جیسے ہمارے گیتوں کی ہواؤں میں کوئی پھول اُچھل رہا ہو! اُسے اِس طرح جھٹکے لگ رہے ہیں جس طرح کسی پُرجوش سمندر کے جھاگوں پر کسی مرغِ آبی کو لگتے ہیں! وہ پالکی میں اس طرح تیرتی ہوئی جا رہی ہے جیسے الفاظ فضائے تصور میں تیر رہے ہوں
ہم آج مسرور ہیں — اور گا رہے ہیں اس خوشی میں! ہم اسے اپنے کندھوں پر اس طرح لئے جا رہے ہیں جیسے کسی سلکِ ریشمیں میں موتی آویزاں ہوں!

آہستہ آہستہ بہت سہج سہج ہم اس پردہ نشین کو لے جا رہے ہیں۔
یہ پالکی نشین ایک ستارہ کی مانند ہے جو کسی شبنمی صبح میں دمک رہا ہو۔
وہ اس طرح اچھلتی ہے جس طرح کسی لہر پر سورج کی کرنیں اچھلتی ہیں! اس کا گرنا ایسا ہی جیسے کسی دلہن کے قطراتِ اشک کا نزول!
ہم آج مسرور ہیں اور گا رہے ہیں۔ اس خوشی میں!
ہم اسے اپنے کندھوں پر اس طرح لئے جا رہے ہیں جیسے کسی سلکِ ریشمیں میں جواہر آویزاں ہوں۔

"عصمت"

نئی کتابیں

دیوانِ ستاک - ہندوستان میں بمبئی اپنی تجارتی مرکزیت کی وجہ سے ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہر ملک و قوم کے لوگوں سے ملاقات بآسانی ہو سکتی ہے، اور وہ بھی نہ صرف عوام سے بلکہ صاحبانِ ذوق و ادب سے بھی۔ ایرانیانِ مقیم بمبئی میں ایک جناب میرزا محمد خاں طلعت یزدی ہیں۔ آپ ادیب ہیں۔ شاعر ہیں۔ شاہنامہ پڑھنے میں مشہور اور نظم خوانی میں معروف ہیں۔ نغمۂ ایرانی کے بمبئی میں مشہور و معلوم اُستاد ہیں اور بمبئی کے ریڈیو کے پروگرام میں فارسی چیزیں آپ ہی گاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص جو ایرانی ہونے کے ساتھ اتنی خصوصیات رکھتا ہو اس کا کلام ضرور قابلِ ستائش ہونا چاہیئے۔ آپ نے اپنا کلام مرتب کر کے "دیوانِ ستاک" کے نام سے نہایت اعلیٰ کاغذ اور بہترین کتابت وطباعت کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ضخامت دو سو صفحات سے زیادہ۔ قیمت مع محصول دو روپے۔ ملنے کا پتہ :- لائبریری محمد طلعت یزدی، پائدھونی حاجی بلڈنگ فرسٹ فلور، بمبئی نمبر ۹۔

لڑکیوں کے لئے نصاب - اُردو کی پہلی، دوسری اور تیسری ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ یہ تینوں کتابیں جناب محمد نصیر صاحب ہمایوں نے لڑکیوں کے لئے ترتیب دی ہیں۔ اگرچہ زبان کے لحاظ سے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے کوئی خاص امتیاز نہیں ہو سکتا لیکن ان کتب میں کئی ایسے اسباق دیئے ہیں جو لڑکیوں کی ساتھ خصوصیت رکھتے ہیں۔ زبان ہر جماعت کی استعداد کے مطابق ہے۔ اسباق کے ضروری حصص ذہن نشین کرانے کے لئے سوالات بھی دیئے گئے ہیں اور مشکل الفاظ کے معانی بھی۔ لکھائی چھپائی، کاغذ اور ترتیبِ مضامین کے لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمایوں صاحب کی یہ کوشش قابلِ تحسین ہے۔ قیمت درج نہیں۔ پنجاب پرنٹنگ ورکس بک ڈپو، انارکلی لاہور سے طلب فرمائیے۔

"رہنمائے تعلیم" - یہ سررشتۂ تعلیم پنجاب کا سب سے پُرانا اور مفید رسالہ ہے جسے ماسٹر جگت سنگھ صاحب گذشتہ پچیس سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکال رہے ہیں زیرِ نظر پرچہ "رہنمائے تعلیم" کا جوبلی نمبر ہے جو رسالے کے بجائے ایک مبسوط اور ضخیم کتاب کی صورت میں شائع ہوا ہے۔ اشتہاروں کے چند صفحے شامل کر کے اس کا حجم ۲۴۷ صفحات ہوتا ہے جن میں ۴۴ مضامین اور ۹ یکرنگی و سہ رنگی تصاویر ہیں۔ اکثر مضامین ملک کے مشہور ادبا و فضلا سے لکھائے گئے ہیں تعلیم اور تنقید کی متعلق بعض مضامین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں حصۂ نظم بلند پایہ اور دلکش ہے تصاویر کا انتخاب نہایت موزوں و مناسب ہے۔ ہم ماسٹر صاحب کی اولوالعزمی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے اس قدر محنت اور صرفِ کثیر کے بعد اس کی قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے مقرر کی ہے۔ اس حقیر رقم میں محض اس کی تصویریں بھی مہنگی نہیں۔ مدرخواستیں ماسٹر صاحب کے نام رام گلی لاہور کے پتہ سے بھیجیے۔

خاندان غزنویہ کی مستند تاریخ

دولت غزنویہ، باتصویر

اردو زبان میں سلطان محمود غزنوی اور سلاطین غزنویہ کی کوئی مکمل اور مستند تاریخی کتاب موجود نہ تھی اور ہندوستان کی تاریخ میں سلطان محمود غزنوی کو برے رنگ میں دکھانے کی جو غیر صحیح کوشش کی گئی ہیں انکا اقتضا یہ تھا کہ اس موضوع پر کوئی اچھی کتاب لکھی جائے دولت غزنویہ نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ اور اردو زبان میں یہ سب سے پہلی مستند تاریخ ہے آغاز میں ہندوستان پر عربوں کے حملے اور تسلط کے واقعات بھی اجمالاً بیان کر دئے گئے ہیں سلطان کے حالات اور ہندوستان کی سرزمین پر پے در پے سترہ" حملوں کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اس کے ہر حملے کے اسباب اس کے خلاف ہندوستان کے راجاؤں کے ساز باز اور مفتوحین کے ساتھ سلطان کے اچھے سلوک کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ سلطان کے تمام جانشینوں کے حالات غوریوں کی آخری کامیابی اور خاندان غزنویہ کے خاتمہ تک درج ہیں۔ اس طرح یہ تاریخ سلطان محمود کی ایک مفصل سوانحعمری کے علاوہ خاندان غزنویہ کی مستند تاریخ بن گئی ہے۔ کتاب سہ رنگی دو رنگی اور ایک رنگی تصاویر سے مزین ہے حجم چار سو صفحات قیمت غیر مجلد عمہ دو روپے اور مجلد عہ دو روپے چار آنے علاوہ محصول ڈاک۔

صلیبی جنگوں کی داستان یعنی حیات صلاح الدین ایوبی۔ شیر اسلام صلاح الدین غازی کے مکمل حالات عیسائیوں کے مذہبی دل لشکر سے مقابلے اور عیسائیوں کی شکستیں وغیرہ اس کتاب کو پڑھکر مردہ دل مسلمان کے دل میں بھی ایک دفعہ مجاہدانہ شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ قیمت عمہ دو روپے علاوہ محصول ڈاک۔

تعبیر نامہ خواب صدیقی۔ موجودہ زمانہ کی ایجادات مثلاً ریل۔ تار ڈاک۔ ہوائی جہاز۔ پوسٹ کارڈ۔ گراموفون۔ بائسکوپ۔ موٹر کار۔ بائسکل وغیرہ وغیرہ خوابوں کی مفصل تعبیریں درج ہیں اس کے علاوہ قیافہ شناسی سے متعلق ایک نایاب مضمون کتاب کے آخر میں درج ہے قیمت عہ ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول۔

ملنے کا پتہ: مہتمم کتب خانہ دار الادب بازار حکیماں لاہور

بہترین فرنیچر

ایم حیات اینڈ سنز (لاہور) کے ہاں سے مل سکتا ہے۔

ہم فرنیچر سازی کے فن میں اپنے قدیم تجربہ اور غیر محدود ذرائع کی امداد سے اپنی مصنوعات میں آراستگی اور مناسبت کو درجہ کمال پر پہنچا سکے ہیں
یہی وجہ ہے کہ ہمجوار گھرانوں میں فرنیچر کی خرید کا خیال آتے ہی

حیات اینڈ سنز کا نام لیا جاتا ہے۔

وہ فرنیچر
سب سے زیادہ مہلک ہے
جسے آپ نے
سستا سمجھکر خریدا لیکن
بہت جلد اس نے ٹکڑے ٹکڑے
ہوکر آپ کے مکان کو
کباڑخانہ بنا دیا۔

سستا فرنیچر
وہی ہے جو سالہا سال تک
آپ کے زیر استعمال
رہنے کے علاوہ
آپ کے دولتکدہ کی
زینت
کو دوبالا کرتا ہے
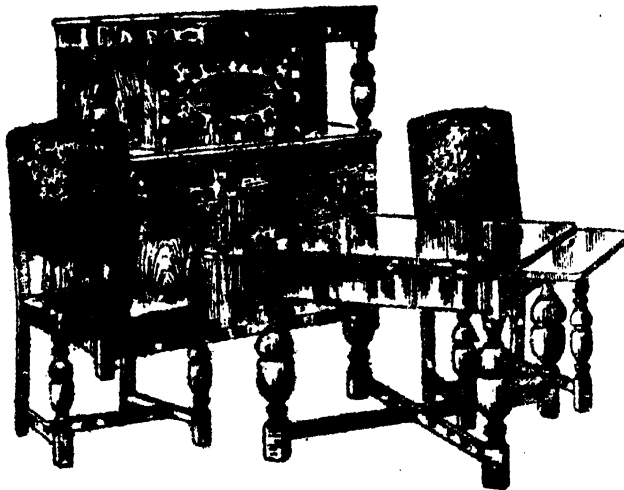
ہمارے شوروم میں بلا تامل تشریف لائیے اور ہماری اشیا کا ملاحظہ فرمایئے جنہیں خریدنے کے بعد آپ سالہا سال تک مطمئن ہوجائینگے۔
یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے خریدار اپنے فرنیچر پر ہمیشہ فخر کرتے ہیں *

ایم حیات اینڈ سنز ہال روڈ لاہور۔

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمایئے،

اعلیٰ طبقہ کی خواتین سر میں لگانے کیلئے اس کارخانہ کا تیار کردہ بانو ہیر آئیل استعمال کرتی ہیں۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

طبقۂ نسواں میں اس کارخانہ کا عطر سہاگ اور عطر عروس نہایت مقبول ہے،

یہ کارخانہ سنہ ۱۸۳۹ء سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے۔

۱- "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور ساڑھے نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۲۰ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸- جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر نمونہ ۶ر۔

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳- لارنس روڈ لاہور

عبداللطیف مینیجر رسالہ ہمایوں نے مسلم پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا